ISSN 2321-4627

15/- روپے

جون 2022ء

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

پروفیسر مغنی تبسم

تاریخ پیدائش: 13/جون 1930ء

علامہ شبلی نعمانی

تاریخ پیدائش: 4/جون 1857ء

جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ نے 2 جون 2022ء کو یوم تاسیس تلنگانہ کے موقع پر مستقر جگتیال میں پرچم کشائی انجام دی۔ تصویر میں پولیس اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں

جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ حج 2022ء کے انتظامات کے سلسلہ میں حج ہاؤز حیدرآباد میں تلنگانہ وآندھراپردیش کے تمام متعلقہ محکمہ جات کے عہدیداروں کے ساتھ منعقدہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ' محابس وفائر سرویسیز حکومت تلنگانہ' جناب اے۔ کے۔ خان آئی پی ایس (موظف) عزت مآب مشیر اقلیتی بہبود تلنگانہ' جناب محمد سلیم صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ حج کمیٹی' جناب بدویل شیخ غوث الاعظم صدر نشین آندھراپردیش اسٹیٹ حج کمیٹی' جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' جناب اے۔ محمد امتیاز پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت آندھراپردیش' جناب بی۔ شفیع اللہ ایکزکیٹیو آفیسر تلنگانہ اسٹیٹ حج کمیٹی ودیگر عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں۔

قرینہ

ہم کلامی	شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس	4

یادرفتگاں

بھاشا زبان اور مسلمان	علامہ شبلی نعمانی	5
علامہ شبلی نعمانی (ماخوذ از: پیوپلس پل ڈاٹ کام)	ترجمہ و تلخیص: محمد ارشد مبین زبیری	13
پروفیسر مغنی تبسم	ڈاکٹر ناظم علی	17

مضامین

لسان العصر اکبر الہ آبادی اور اثبات و نفی	ڈاکٹر قسیم اختر	20
مہاتما گاندھی کی خودنوشت اور اس کے اردو تراجم	سید انعام الرحمٰن	26
ادب و صحافت کا مشعل بردار قمر اقبال	ڈاکٹر جہانگیر احساس	33
نسیمہ تراب الحسن کی خاکہ نگاری	رمیض سلطان پوری	40
معراج العاشقین کے محققین کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ	مشتاق فاروق	45
غالب کے خطوط یا منظر کشی	محمد شوکت فہیم احمد	53

تعلیم و روزگار

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور اسکولی تعلیم	ڈاکٹر محمد افروز عالم	56

سائنس و ٹکنالوجی

سائنسداں چاند کی مٹی میں پودوں کو اگانے میں کامیاب	محمد احمد خان	63

افسانے

شکوہ شکایت	منشی پریم چند	66
بکھر گئے خواب بچپن کے	خیر النساء علیم	73

حصہ نظم

غزلیں	پروفیسر مظفر شہ میری / شاہد ندیم	81
غزلیں	اشہر ہاشمی / جہانگیر قیاس	82

oOo

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، فنی، تہذیبی ترجمان

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد: 07 شمارہ: 06 جون 2022ء

ایڈیٹر

شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-500 001 (تلنگانہ)

مقام اشاعت: تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana.
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

ہم کلامی

ماہ جون 2022ء کا شمارہ آپ کی نذر ہے۔ اس شمارے میں ہم نے حسب معمول یادرفتگاں کے تحت دو اہم شخصیات کے کوائف وعلمی کارناموں سے واقف کروانے کی کوشش کی ہے۔ جن میں ایک مایہ ناز وممتاز ادیب' مورخ' نقاد' عالم دین اور ماہر استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ' اور دوسرے عصر حاضر کے دکن کے ماہر استاذ' محقق' نقاد' صحافی اور افسانہ نگار پروفیسر مغنی تبسم کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معلوماتی ادبی وسائنسی مضامین' ممتاز افسانہ نگاروں کے دلچسپ افسانے اور آخر میں حصہ نظم میں ممتاز شعرائے کرام کا کلام شائع کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ نگارشات قارئین کی معلومات ودلچسپیوں میں معاون ہوں گی۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ انسانی زندگی کے لئے تعلیم انتہائی ضروری چیز ہے، اور یہ انسانی تہذیب کی نشوونما میں معاون ہے۔ علم کی مدد سے ہم اپنی زندگی کے لیے ایک نیا نقطہ نظر تیار کر سکتے ہیں۔ اگر لوگ تعلیم یافتہ ہوں تو وہ اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کو بخوبی جان سکتے ہیں۔ تعلیم معاشرے میں سب کے درمیان مساوات کا علم فراہم کرتی ہے اور قوم کی ترقی اور بہتری کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں اقلیتوں میں خواندگی کا تناسب بہت کم ہے۔ جب کہ ہر انسان کو اپنی نجی زندگی میں آگے بڑھنے اور کسی اہم چیز کو سمجھنے کا ایک بہت ہی طاقتور ذریعہ تعلیم ہی ہے۔ تعلیمی دور کے ذریعے حاصل کی گئی مہارت ہر ایک کو نیا حوصلہ دیتی ہے۔ آگے کی زندگی میں حقیقی امکانات حاصل کرنے کا ایک بہترین طریقہ تعلیم حاصل کرنا ہے' جس کے ذریعہ سے اپنے کیریئر کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے خاص طور پر دیہی علاقوں میں ہماری زندگی میں تعلیم اور اس کے فوائد کے بارے میں سب کو آگاہ کرنے کے لیے مختلف پروگرام بھی ترتیب دیے جاتے ہیں۔

ہر بچے کا زندگی میں کچھ منفرد کرنے کا اپنا وژن ہوتا ہے۔ بعض اوقات والدین اپنے بچوں کے ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس' آئی ایف ایس یا آئی پی ایس' آفیسر بنانے کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ تعلیم کے شعبوں میں بچوں کی دلچسپیوں کے مطابق انہیں تعلیم دلوائیں' اپنی مرضی ان پر مسلط نہ کریں۔ اس جدید ٹکنالوجی کے دور میں اور مسابقت کی دوڑ میں زندگی کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ایک کو اچھی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ تعلیم بہتر ملازمت بھی فراہم کرتی ہے اور زندگی کو نئے زاویے سے سمجھنے کی صلاحیت بھی بڑھاتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اپنی نئی نسل کو مہارت کی اعلی سطح تک پہنچانے، ان کی تکنیکی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں فکری، اور اخلاقی طور پر طاقتور بنانے کی کوشش کی جائے' یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب ہم انہیں بہتر تعلیم دلائیں۔

عام طور پر ہر سال ماہ جون میں مدارس میں نئے داخلے ہوتے ہیں' بچوں کے والدین اور سرپرست زیادہ سے زیادہ اپنے بچوں کو مدارس میں شریک کروائیں اور انہیں تعلیم سے آراستہ کریں اور تعلیم کے حاصل کرنے میں مادری زبان ''اردو'' کا خاص خیال رکھیں۔ بچوں کو اردو سکھائیں اور پڑھائیں۔ حکومت تلنگانہ کے تحت اقامتی مدارس میں بھی اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان تعلیم دی جارہی ہے' اور دیگر مدارس میں بھی اردو تعلیم کا انتظام ہے' اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے بچوں کو دیگر زبانوں کے ساتھ اردو بھی پڑھائیں۔

عزت مآب وزیر اعلی ریاست تلنگانہ اردو زبان کی ترقی وترویج کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اور ان کے احکام کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کو مسابقتی امتحانات میں شرکت میں آسانی کے لئے اردو میں مطالعاتی مواد تیار کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ان امتحانات کے لئے اردو میں کوئی مواد نہیں تھا۔ طلبہ اس مواد سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اردو زبان وادب کی ترقی وترویج' فروغ اور تحفظ کی کوشش میں مصروف ہے اور تمام محبان اردو سے خواہش مند ہے کہ وہ اردو زبان کے تحفظ کے سلسلہ میں اپنے زرین مشوروں سے نوازتے رہیں' آپ کی آراء کی قدر کی جائے گی۔

شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس

ایڈیٹر

بھاشا، زبان اور مسلمان

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک سربرآوردہ ہندو ایڈیٹر نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں دعویٰ کیا تھا کہ ''مسلمانوں نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ہندی علم وادب پر کبھی توجہ نہیں کی اور اگر اتفاقیہ کسی نے کچھ کی تو اس کو مسلمانوں نے کافر کہہ کے پکارا۔'' اس کا جواب الندوہ کے پرچہ میں ''مسلمانوں کی بےتعصبی'' کے عنوان سے لکھا گیا تھا، جس میں مسلمانوں کی ان فیاضیوں کو بہ تفصیل دکھایا گیا تھا جو سنسکرت اور بھاشا کی تصنیفات کی حفاظت اور ترجے اور اشاعت کے متعلق ان سے ظہور میں آئیں۔ یہ مضمون اسی کا دوسرا حصہ ہے، اس میں یہ دکھایا ہے کہ ترجے اور اشاعت کے علاوہ مسلمانوں نے خود بھاشا زبان میں کیا کیا تصنیفات کیں اور بھاشا کی شاعری میں کس درجے کا کمال پیدا کیا۔

یہ امر بھی اس موقع پر لحاظ کے قابل ہے کہ سنسکرت زبان ایک مدت سے متروک ہے، یعنی ایک زمانہ دراز سے خود ہندو بھی اس زبان میں تصنیف وتالیف نہیں کرتے اور اسلام کے زمانے سے تو غالباً کوئی کتاب اس زبان میں نہیں لکھی گئی۔ ہندوؤں کی تصنیفات یا شاعری جو کچھ ہے، بھاکھا زبان میں ہے، اس لئے مسلمانوں نے بھی جو کچھ لکھا اسی بھاکھا زبان میں لکھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکھا زبان میں شعروشاعری کی وہ امیر خسرو ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے کا پتا آگے تک چلتا ہے۔

مسعود سعد سلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے، اور جو امیر خسرو سے تقریباً دو سو برس پہلے تھا، اس کی نسبت تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں بھی اس نے ایک دیوان لکھا تھا، تذکرہ مجمع الفصحا میں لکھا ہے، ''الحاصل دی راسہ دیوان بود تازی، ہندی وپارسی۔''

اس واقعے سے صرف والہ داغستانی نے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی زبان میں اس قدر کمال پیدا نہیں کرسکتا کہ اس میں شاعری کر سکے۔ لیکن مولوی غلام علی آزاد نے اس شبہ کو اس طرح رفع کردیا کہ مسعود سعد سلمان گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا، لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا، اس لئے ایک ہندوستان زاد کا ہندی میں اس درجے کا کمال پیدا کرنا کچھ بعید نہیں۔ حضرت امیر خسرو نے سنسکرت اور بھاکھا میں جو کمال پیدا کیا وہ محتاج اظہار نہیں، مثنوی نہ سپہر میں انہوں نے خود اپنی سنسکرت دانی کا ذکر کیا ہے، افسوس ہے کہ ان کے بھاکھا کے خالص اشعار آج ناپید ہیں، عام زبانوں پر صرف وہ اشعار ہیں، جن میں انہوں نے فارسی اور بھاکھا کو پیوند دیا ہے، مثلاً:

چوں شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں
زمہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نینان نہ انگ چیناں
نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

(آنکھ، بدن، آرام، خط)

اس طرز کے ان کے اشعار عام طور پر مشہور ہیں اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔

امیر خسرو کے بعد شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی پیدا ہوئے۔ وہ بھاکھا زبان کے ایسے بڑے زبردست شاعر تھے کہ خود ہندوؤں میں آج تک ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا۔ پدماوت ان کی مثنوی آج موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے، ہندوؤں میں سب سے بڑا شاعر آخر زمانے کا کالیداس گزرا ہے، جس نے رامائن کا بھاکھا میں ترجمہ کیا ہے۔ نکتہ شناسوں کا بیان ہے کہ قدرت زبان کے لحاظ سے پدماوت کسی طرح رامائن سے کم نہیں اور اس قدر تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ پدماوت کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاؤ، عربی فارسی کے الفاظ مطلق نہیں آتے اور یوں شاذ و نادر تو رامائن بھی ایسے الفاظ سے خالی نہیں، ملاحظہ ہوں رامائن کے بعض اشعار:

رام انیک گریب نواجے
لوگ بربر برو براجے
غریب نواز
گنی، گریب، گرام، نرناگر
پنڈت موٹے ملیں او جاگر
غنی غریب

ملک محمد جائسی نے پدماوت کے سوا بھاکھا میں اور بھی دو مثنویاں لکھیں، جو ان کے خاندان میں اب بھی موجود ہیں، لیکن افسوس کہ ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

اکبر کے زمانے میں ہندی زبان کو اور بھی قبول عام حاصل ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ امرا اور شہزادے تک ہندی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ شہزادہ دانیال (پسر اکبر شاہ) کے ضمنی تذکرے میں جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے، ''بہ نغمہ ہندی مائل بود، گاہے بہ زبان اہل ہندو باصطلاح ایشان شعرے می گفت، بدنبودے۔''

عبدالرحیم خان خاناں جو دربار اکبری کا گل سرسبد تھا، ہندی شاعری میں کمال کا درجہ رکھتا تھا، اسی کتاب میں خان خاناں کی وفات کے ذکر میں لکھا ہے، ''خان خاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود و زبان عربی وترکی وفارسی و ہندی می دانست واز اقسام دانش عقلی ونقلی حتی علوم ہندی بہرہ وافی داشت و بزبان فارسی و ہندی شعر نکو گفتے۔'' جہانگیر کے زمانے میں غواصی نامی ایک شاعر تھا، اس نے طوطی نامہ کو جو نثر میں تھا، اس طرح نظم کیا کہ ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی میں تھا۔ اس سے اس کی قدرت زبان کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ میر حسن صاحب اپنے تذکرہ شعرا میں لکھتے ہیں:

''غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود، طوطی نامہ بخشی رانظم نمودہ است بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور بکٹ کہانی۔ سرسری دیدہ بودم شعر آن نظم بہ یاد نیست۔''

اسی زمانے میں ملا نوری ایک بزرگ تھے، قصبہ اعظم پور کے قاضی زادوں میں تھے اور فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے، وہ اگرچہ فارسی کہتے تھے، لیکن کبھی کبھی

ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ ریختہ یعنی اردو زبان کی ترکیبیں بھی ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ میرحسن صاحب نے اپنے تذکرے میں ان کا ایک شعر نقل کیا ہے:

ہر کس کہ خیانت کند البتہ نبرسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اکبری اور جہانگیری دور میں سب سے زیادہ جس نے اس فن میں نام پیدا کیا وہ شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف فربلی تھے۔ یہ بلگرام کے رہنے والے تھے اور حصار کی حکومت پر ممتاز تھے۔ ایک دفعہ سفر میں ایک ہندو لڑکی کی حاضر جوابی ان کو بہت پسند آئی، اس کو ساتھ لائے اور تربیت کی، چنانچہ ان کے اکثر دوہے اور کبت اسی کے ساتھ سوال و جواب میں ہیں۔ ایک دفعہ سفر سے آئے، اس نے ان کو مدت کے بعد دیکھا تو جوش محبت سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے کہا:

کم ورگ دھری سنار
مم آیو بھار یونہیں

(کیوں تیری آنکھ آبدیدہ ہوئی اے نازنین، کیا میرا آنا پسند نہیں ہوا؟)

اس نے برجستہ کہا،

لینھن نین پکھار
لمن ہتی تو کو درس بن

(آنکھ صاف کرنا، گردآلود تیرے دیدار کے بغیر)

یعنی چونکہ میری آنکھیں تمہاری جدائی میں گردآلود ہو رہی تھیں، اس لئے میں نے ان کو آنسوؤں سے دھولیا۔

شیخ محمد کے اشعار نہایت کثرت سے سروآزاد کے دوسرے حصے میں نقل کئے ہیں۔

تیموری سلاطین بھاشا زبان کی شاعری کی اسی طرح قدردانی کرتے تھے، جس وہ اپنی شاہی زبان (فارسی) کے قدردان تھے۔ اور یہ اس بات کا بڑا سبب تھا کہ ہندی شاعری بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی۔ راجہ سورج سنگھ نے جب ایک ہندو شاعر کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا اور اس نے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی تو جہانگیر نے ایک ہاتھی انعام میں دیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے، ''بایں تازگی مضمونے از شعرائے ہندکم بگوش رسیدہ بہ جلد دے ایں مدح فیلے بہ او مرحمت کردم۔'' جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا۔

گر پسر داشتے جہان افروز
شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زان کہ چوں او نہفت افسرزر
بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر
شکرکز بعد او چنان پدرے
جانشین گشت این چنین پسرے
کہ زشنقار گشتن آن شاہ
کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی کیوں کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے تو اس کا بیٹا، اس کے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد (اکبر شاہ) کو خدا نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا۔ ہندی تصنیفات کے ساتھ مسلمانوں کی توجہ کی یہ نوبت پہنچی کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابوں کو زبانی یاد کرتے تھے۔ امین رازی تذکرہ ہفت اقلیم میں میر ہاشم محترم کے حال میں لکھتے ہیں، ''امروز در ہندست، تمام کتاب مہابھارت را کہ متجمع اسامی غریبہ و حکایات عجیب است در ذکر دارد۔''

اس مسئلے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عالمگیر کو نہایت متعصب کہا جاتا ہے، اور عام خیال ہے کہ وہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر اس کے زمانے میں توجہ کی، پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ضمیر ایران کا ایک مشہور شاعر تھا، وہ عالمگیر کے زمانے میں ایران سے آیا اور شاہی منصب داروں میں مقرر ہوا۔ اس نے بھاشا زبان میں انتہا درجے کا کمال پیدا کیا۔ اگر چہ بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہیں کر سکتا تھا، تاہم اس زبان میں نہایت برجستہ اشعار کہتا تھا۔ ہندی میں اس کا تخلص پنچھی تھا۔ یار جا تک جو موسیقی میں ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ اسی نے فارسی زبان میں کیا۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں اس کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں،

''درعہد عالمگیر بادشاہ از ولایت ایران بہ ہند آمدہ و در مسلک منصب داران شاہی انتظام داشت و باوجود آں کہ بہ ہند آمدہ زبان ایں ولایت آموخت اما بواسطہ حدت ذہن در نظم ہندی طبع او آن قدر دخیل شد کہ از جملہ استادان فن برآمد زبانش بہ تلفظ ایں زبان خوب نمی گردید، اما نظم بسیار پختہ واقع می شد در ہندی پنچھی تخلص می کرد۔ ترجمہ یا رجاتک در فن رقص و نغمات ہندی از وست۔''

عالمگیر ہی کے متوسلین میں ایک شاعر دانا تخلص تھا، اس کی نسبت مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں، ''نظم ہندی بسیار خوب گفتہ۔''

بھاشا کی زبان دانی اور شاعری کا ذوق اس زمانے میں اس قدر عام ہوا کہ بڑے بڑے علما اور حضرات صوفیہ اس میں کمال پیدا کرتے تھے۔ شیخ غلام مصطفے متخلص بہ انسان بہت بڑے پایے کے شخص گزرے ہیں۔ وہ قوم کے کنبو اور مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ معقولات کی تحصیل حضرت ملا قطب الدین شہید سہالوی (جد مولانا بحر العلوم) کی خدمت میں کی، حدیث کا فن محدث دہلوی کے خاندان سے حاصل کیا، تصوف میں شیخ جان محمد شاہجہاں آبادی کے مرید تھے۔ طب، نجوم، خوش نویسی، فن جنگ، ان تمام چیزوں میں کمال

رکھتے تھے، عالمگیر کے زمانے میں منصب داری کے عہدے پر مامور ہو کر دکن گئے لیکن چند روز کے بعد استعفیٰ دے کر چلے آئے۔ ۱۱۲۴ میں بہ مقام ایچلپور وفات پائی۔ ہندی زبان اور بھاشا کی شاعری میں ان کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ مولوی غلام علی آزاد کی عبارت ذیل سے ہوسکتا ہے۔

''علم ہندی بحسیثیتے کہ اکثر براہمہ حل غوامض از خدمت شیخ می کردند و شعر ہندی نیز خوب می گفت، صنادید شعرائے ہندی برہمن درحضور اوسر فرودمی آوردند و اصلاح کبت ودوہا می گرفتند۔''

سرو آزاد

عبدالجلیل بلگرامی (مولوی غلام علی آزاد کے نانا) جو عالمگیر کے درباری تھے، ہندی زبان کے ممتاز شاعر تھے۔ فارسی قصیدوں میں بھی کہیں کہیں بھاشا بول جاتے ہیں، چنانچہ ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:

اسیس دیکے، کہے ہندوی میں یوں سمت

رہے جگت میں اچل باس یہ وزیر سدا

یہ ذوق اس قدر ترقی کرتا گیا کہ محمد شاہ کے زمانے میں جب راجہ جے سنگھ والی جے پور نے بیس لاکھ کے صرف سے رصد خانہ قائم کیا اور فن ریاضی کے ساتھ نہایت اہتمام کیا تو علمائے اسلام نے اس کے حکم سے شرح چغمنی اور ہیئت کی اور کتابوں کا ترجمہ بھاشا زبان میں کیا۔ چانچہ آزاد، سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں:

''وقد نقل العلما الاہاندبامر جی سنگھ شرح الچغنی و غیرہ من کتب للھیئۃ والہندسۃ من العربیہ الی الہندیۃ''۔

(سبحۃ المرجان ص ۴۳۱)

(ہندوستان کے علما نے جے سنگھ کے حکم سے شرح چغمنی وغیرہ کتابوں کا جو علم ہیئت اور ہندسہ میں تھی، عربی زبان سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔)

شرح چغمنی اس درجے کی مشکل کتاب ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا، اس سے قیاس کرنا چاہئے کہ جو علما بھاشا زبان میں اس کا ترجمہ کرسکے، ان کی بھاشادانی کا کیا رتبہ ہوگا۔

اسی زمانے میں سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کے علم وادب میں نہایت شہرت حاصل کی، سنسکرت کے حاصل کرنے کے لئے بنارس کا سفر کیا اور وہاں رہ کر اس علم کی تکمیل کی، ہندی موسیقی میں اس درجے کا کمال پیدا کیا کہ لوگ ان کو نایک کہتے تھے۔ چنانچہ اس فن کے متعلق بھاشا میں دو کتابیں تصنیف کیں، ناؤ چندرکا اور مدھنا یک سنگار، بھاشا میں مدھنا یک تخلص کرتے تھے۔ ۱۰۰۹ میں وفات پائی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

''جو چترانن چت چڑھے، نہ بڈھے، بدھ بیدن، گرنتھ نہ گائے''

(فرشتہ، دل، ترکیب وصورت، عقلا کتب آسمانی قدیم کتابیں)

''بھارتھی، بھوری کری، بھرین، جپ، جوگن،

جوگ اتھیہ گنائے''

(گویائی، سجہ گردانی، ریاضت، مرتاض)

''جومکھ جوت جگی، نہ تھگی، مدھنا یک گھونگھٹ چنچل تائے''

(چہرہ، روشنی، نام شاعر، شوخی)

''جھنین، دوکول، چھے جھلکی، اچھ، براجت، اچھ رجھائے''

(باریک، دوپٹا، زیب دینا، بے مثل، فریفتہ کرنا)

-000-

مطلب یہ ہے کہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر جس قدر خوش نما ہیں، اس کی خوبی فرشتوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی اور نہ آسمان کی کتابوں میں ان کی توصیف پائی جاتی ہے۔ قوت نطق خود محو حیرت ہے اور زاہد مرتاض سجہ گردانی سے بھی زیادہ اس کا مداح ہے۔ نقاب تک ان آنکھوں کی خوبی کو چھپا نہیں سکتی بلکہ باریک دوپٹا اس کی خوبی اور بھی دوبالا کر دیتا ہے۔ ان کا بہت سا کلام سرو آزاد میں نقل کیا ہے۔ لیکن چونکہ ناظرین کے لئے وہ نامانوس صدا ہوگی، اس لئے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں۔

سید رحمت اللہ پسر سید خیر الدین بلگرامی بھاشا زبان کے مشہور استاد تھے۔ سلطنت کی طرف سے دو صدی منصب اور جاگیر مقرر تھی۔ اس زمانے میں بھاشا کا مشہور چنتامن ایک ہندو تھا، اس کا ایک شاگرد رحمت اللہ کا شہرہ سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چنتامن کا دوہا ان کے سامنے پڑھا۔

ہیوھرت ارکرت ات چنتامن چت چین

وامرگ نینے کی لکھی واہی کی سی نین

سید رحمت اللہ نے اس دوہے میں غلطی نکالی اور چنتامن نے سنا تو غلطی تسلیم کر کے اس کی اصلاح کر دی۔ چنتامن نے سید رحمت اللہ کی مدح میں ایک دوہا بھی لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

''گرب، گھ سنگ، جیون، سبل، کل گاج من، پربل گج باج، دل، ساج، دھایو''

(غرور، شیر، بطور قوی اظہار دلیری، زبردست ہاتھی، گھوڑا، فوج، آراستہ، حملہ کیا)

''بجت اک جمک گھن گھمک دندبھن کی ترنگ، کھر، دھمک، بھوتل ہلایو''

(ایک طرح پر، گردون شگاف، نقارہ، گھوڑے کا سم، زمین)

سید رحمت اللہ نے ۳۱ ربیع الاول ۱۱۱۸ میں وفات پائی۔ ان کے بہت سے دوہے سرو آزاد میں نقل کئے ہیں، ہم صرف ایک پر اکتفا کرتے ہیں۔

کراچائے جھائے تیر دھاری بھج یہ بھائے

(ہاتھ بلند کرنا، انگڑائی، بازو، خوش نما معلوم ہوئے)

منو چیلا دوی چمک ہوئے گری بھوم پر آئے

(گویا بجلی، زمین)

یعنی محبوب نے جمائی لیتے ہوئے جب دونوں ہاتھ اٹھا کر نیچے کر لیے تو یہ معلوم ہوا کہ گویا دو بجلیاں چمک

کر زمین پر گر پڑیں۔

سید غلام نبی پسر سید محمد باقر، سید عبد الجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے، ۲ محرم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سید عبدالجلیل اس زمانے میں عالمگیر کے ساتھ دکن کی مہم پر تھے۔ بھانجے کے پیدا ہونے کی خبرسنی تو سال تاریخ کی فکر ہوئی، اسی حالت میں سوگئے اور خواب میں یہ مادہ ہاتھ آیا۔ نور چشم باقر عبدالحمیدم۔

تفاول کے طور پر پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا شاعر ہوگا۔ خدا کی قدرت پیشین گوئی صحیح اتری، اگرچہ عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے، لیکن بھاشا کی شاعری میں نہایت کمال پیدا کیا۔ ۱۱۳۶ میں نواب وزیر اور افاغنہ کی لڑائی میں نواب کے ہمرکاب تھے، اور عین معرکہ جنگ میں مارے گئے۔ مولوی غلام علی آزاد سے نہایت درجے کا اتحاد تھا۔ چنانچہ آزاد نے تاریخ کہی، رقم کردہ ہے غلام نبی۔ بھاشا زبان میں ایک دیوان لکھا جس میں ۱۷۷ دوہے ہیں، اس کا نام انگ درپن رکھا، بھاشا میں ان کا تخلص درس لین ہے، درس کے معنی بھاشا میں دیدار کے ہیں اور لین کے معنی محو کے ہیں اور درسلین کا لفظی ترجمہ محو دیدار ہے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

توحید:

تیری منورتھ کو ہوت ہے سین لوک توں ہی ہوئی اکاش
کمرت نکہت اودت ہے

(مطلب، اشارہ، دینا، آسمان، ستارہ، روشنی)

توں ہی چاروتو، سیل تزپس، پنچھی، ہوت تون ہی میگھ
پوجی کوت اوراکوت ہے

(اربعہ، عناصر، پہاڑ، درخت، چرند پرند، بادل، دیتا ہے، حساب بے حساب)

توں ہی بن ناری بھرتا کی رسلیں موت توں ہی ہوئی کی
سترلب این تن لوت ہے

(عورت، شوہر، خو، دشمن)

جاگ پڑی جھونٹوں جیون سیں لوگ ہوت تیونہیں
اتما بچاری لوک جاگت کو موت ہے

(بیداری، خواب، روح)

یعنی تیرے ہی اشارے سے دنیا پیدا ہوتی ہے، تو ہی آسمان بن کر ستاروں کو روشن کرتا ہے، تو ہی اربعہ عناصر اور پہاڑ، درخت، چرند اور پرند بن جاتا ہے، تو ہی بادل بن کر بے حساب بارش کرتا ہے، تو ہی عورت کے قالب میں آکر مرد کا راحت رساں ہے، تو ہی بالآخر موت کی صورت میں جان کا دشمن ہے، تو جس طرح کہ جاگنے کے بعد خواب بالکل وہم معلوم ہوتا ہے اسی طرح خدا شناسوں کے نزدیک یہ دنیا تمام تر خواب ہے۔

سید برکت اللہ بہت بڑے فقیہ تھے۔ بھاشا میں شعر کہتے تھے۔ اور پیمی تخلص کرتے تھے۔ بھاشا میں جوان کی نظموں کا مجموعہ ہے، اس کا نام خود پیہم پرس رکھا تھا، سرو آزاد میں ان کا بہت سا کلام نقل کیا ہے، ہم صرف ایک دوہے پر اکتفا کرتے ہیں:

چکہ جوگی کنتھا گرین، ارن، سیام اور سیت
(آنکھ، گلا، سرخ، سیاہ، سفید)
آنسو بوند سمرن لیس درسن بھچا ہیت
(قطرہ، تسبیح، دیدار، خیرات)

یعنی آنکھیں ایک ریاضت کش جوگی ہیں، جو سرخ، سیاہ اور سفید دانوں کا مالا پہنے ہوئے اور آنسوؤں کی تسبیح لئے ہوئے دیدار کی بھیک کی طالب ہیں۔

ان بزرگوں کے سوا اور بہت سے اہل کمال گزرے ہیں جنہوں نے بھاشا زبان کی انشا پردازی اور شاعری میں نام وری حاصل کی، اور جن کے حالات مختلف تذکروں میں مل سکتے ہیں۔ کیا ان واقعات کے بعد بھی ہمارے ہندو دوست کا یہ بیان قابل تسلیم ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ہندو لٹریچر پر توجہ نہیں کی اور جو کرنا چاہتا تھا وہ کافر قرار پاتا تھا۔ ہمارے ہندو دوستوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں سے زیادہ بے تعصب قوم، نہ صرف دنیا کی پچھلی تاریخ بلکہ موجودہ اور آئندہ زمانہ بھی قیامت تک نہ پیش کر سکے گا۔

حاشیے :

(۱) میر حسن مصنف بدر منیر کا تذکرہ شعرا ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۲) یہ بات جتا دینے کے قابل ہے کہ مولوی غلام آزاد نے سرو آزاد جو تذکرہ لکھا اس سے دو حصے کئے۔ ایک فارسی شعرا کے ذکر میں اور دوسرے ہندی یعنی بھاشا کہنے والوں کے حالات میں، اس دوسرے حصے کی تمہید میں لکھتے ہیں، ''فصل ثانی در ذکر قافیہ سنجان ہندی جزاہم اللہ بجائزۃ الخیر من ہیچمدان باز بان عربی و فارسی و ہندی آشنائیم واز ہر سہ میکدہ بقدر حوصلہ قدرے می پیایم، مشق سخن ہندی ہر چند اتفاق نیفتاد، اما سامعہ راز نوائے طوطیان ہند حظے وافر است و ذائقہ راز چاشنی شکر فروشاں ایں گل زمیں نصیبے متکاثر، افسوس خوانان ہند ہم دریں مادی پائے کمی ندارند بلکہ در فن نایکا بید قدم سحر سازی پیش می گزارند، موزونان زبان ہندی در بلگرام فراوان جلوہ نمودہ اند، لہٰذا فصل ایں جماعہ علاحدہ بہ تحریر رسید و شمامہ معطرے بدست بوشناسان حوالہ گردید۔'' پھر اس حصے کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،'' بہ اقتضائے ترتیبے کہ دریں تالیف اختیار افتادہ ختم کتاب بر نظم ہندی دست بہم دادہ چہ مضائقہ بعض الفاظ ہندی جزو فرقان عظیم است۔'' سرو آزاد کا یہ حصہ ہمارے دوست نواب نور الحسن خاں خلف اکبر جناب نواب صدیق الحسن خاں مرحوم نے اپنے تذکرہ طور کلیم میں شامل کر لیا، چنانچہ فروغ دوم میں جہاں سے ہندی شعرا کا تذکرہ ہے عبارت تمہیدی بھی وہی سرو آزاد کی ہے۔ میں اس مضمون میں بلگرامی شعرائے بھاکھا کا جو تذکرہ لکھوں گا اور ان کے اشعار نقل کروں گا وہ طور کلیم سے منقول ہوں گے، لیکن طور کلیم کا یہ حصہ دراصل سرو آزاد ہے۔ طور کلیم چھپ گیا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔ اس لئے ناظرین کو وہ بہ آسانی ہاتھ آ سکتا ہے۔

(۱) تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڑھ ص۔۶۷

☆☆☆

ماخوذ از: پیوپلس پل ڈاٹ کام
ترجمہ و تلخیص: محمد ارشد مبین زبیری

علامہ شبلی نعمانی

(4 جون 1857 - 18 نومبر 1914)

علامہ شبلی نعمانی برطانوی راج کے دوران برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے ایک اسلامی اسکالر تھے۔ وہ موجودہ اتر پردیش کے اعظم گڑھ ضلع کے بندوال میں پیدا ہوئے۔ وہ 1883 میں شبلی نیشنل کالج اور اعظم گڑھ میں دارالمصنفین (ہاؤس آف رائٹرز) کے قیام کے لیے جانے جاتے ہیں۔ شبلی عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے ہمہ گیر عالم تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر بہت زیادہ مواد اکٹھا کیا اور اس کو سیرت النبیؐ کے عنوان سے ترتیب دینا شروع کیا لیکن ان کی زندگی میں صرف پہلی دو جلدیں لکھ سکے۔ ان کے ایک لائق اور مورخ و محقق شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے اس مواد سے استفادہ کیا اور اور اپنے مرشد کی وفات کے بعد اس تصنیف کی بقیہ پانچ جلدیں مکمل کیں۔ اس طرح یہ عظیم الشان کارنامہ جملہ 7 جلدوں میں انجام پایا۔

ابتدائی زندگی: علامہ شبلی شیخ حبیب اللہ اور مقیمہ خاتون کے ہاں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کے چھوٹے بھائی تعلیم کے لیے لندن گئے اور بیرسٹر کی ڈگری کے ساتھ واپس ہندوستان آئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کی۔ علامہ شبلی نے روایتی اسلامی تعلیم حاصل کی۔ شبلی نعمانی برطانوی ہندوستان کے اس وقت کے متحدہ صوبوں کے ضلع اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے 'مسلم راجپوت' تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی میں ان کے استاد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی تھے جو ایک عقلیت پسند عالم تھے۔

علامہ شبلی حج کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور وہاں انھوں نے اپنا وقت عرب کے مختلف علماء سے اسلامی الہیات، تاریخ، فلسفہ اور تصوف میں اپنی تعلیم کو آگے بڑھانے کے لیے وقف کیا۔ جب وہ مشرق وسطیٰ سے ہندوستان واپس آئے تو ان کی ملاقات سر سید احمد خان (1817-1898) سے ہوئی جنہوں نے ابھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی تھی۔ سر سید احمد خان کی پیشکش پر یکم فروری 1882 کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیوسٹی میں سولہ سال تک فارسی اور عربی زبانیں پڑھائیں جہاں ان کی ملاقات تھامس آرنلڈ اور دیگر برطانوی اسکالرز سے ہوئی جن سے انہوں نے جدید مغربی خیالات اور افکار سیکھے۔ انہوں نے 1892 میں تھامس آرنلڈ کے ساتھ شام، مصر، ترکی اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کا سفر کیا اور ان کے معاشروں کا براہ راست اور عملی تجربہ حاصل

کیا۔ان کی علمی وادبی صلاحیت نے ایک طرف تھامس آرنلڈ کو متاثر کیا تو دوسری طرف وہ تھامس آرنلڈ سے کافی حد تک متاثر ہوئے اور اس سے ان کے خیالات میں جدیدلمس کی وضاحت ہوتی ہے۔ قاہرہ میں ان کی ملاقات معروف اسلامی اسکالر شیخ محمد عبدہ(1849-1905) سے ہوئی۔

حیدرآباداور لکھنؤ میں: 1898 میں سر سید احمد کی وفات کے بعد، انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی چھوڑ دی اور ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیم میں مشیر بن گئے۔انہوں نے حیدرآباد کے تعلیمی نظام میں بہت سی اصلاحات کا آغاز کیا۔ان کی پالیسی سے حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا۔اس سے پہلے ہندوستان کی کسی اور یونیورسٹی نے اعلیٰ تعلیم میں کسی مقامی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا۔1908 میں وہ حیدرآباد سے ندوہ لکھنؤ چلے گئے جہاں انہوں نے ''ندوۃ العلم'' کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔انہوں نے اسکول کی تدریس اور نصاب میں اصلاحات متعارف کروائیں۔ وہ پانچ سال تک اسکول میں رہے لیکن علماء کے آرتھوڈوکس طبقے نے ان کے خلاف دشمنی اختیار کی، اور انہیں 1913 میں اپنے آبائی شہر اعظم گڑھ کے آس پاس کے علاقے میں آباد ہونے کے لیے لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔

دارالمصنفین کی تاسیس: علامہ شبلی اس سے پہلے ندوہ میں دارالمصنفین یا ایوان مصنفین قائم کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اس وقت ایسا نہ کر سکے۔ بعد میں انہوں نے خود اپنا بنگلہ اور آم کا باغ دارالمصنفین کے قیام کے لئے وقف کیا اور اپنے قبیلے کے افراد اور رشتہ داروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دی۔انہوں نے اپنے شاگردوں اور دیگر نامور افراد کو خطوط لکھے اور ان سے تعاون طلب کیا۔بالآخر ان سب کے تعاون واشتراک سے علامہ شبلی کے خاص شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی کی نگرانی میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ادارے کا پہلا باضابطہ اجلاس علامہ شبلی کی وفات کے تین دن کے اندر 21 نومبر 1914 کو ہوا۔

شبلی کا نظریہ: علامہ شبلی کی ذہانت علی گڑھ یونیورسٹی میں اس وقت کھلی جب وہ سرسید احمد اور برطانوی سکالرز سے رابطے میں آئے۔شبلی اور سرسید احمد دونوں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ مغربی سوچ اور طرز اس کے ساتھ آئے۔ تاہم، سرسید مسلمانوں کو برطانوی استعماری حکمرانوں کی طرف سے 1857 کی جنگ آزادی میں ان کی بھرپور شرکت کے بعد برطانوی حکمرانوں کے قہر سے بچانا چاہتے تھے، جبکہ شبلی انہیں خود انحصار بنانا چاہتے تھے۔تاکہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے ورثے اور روایت کو دوبارہ حاصل کر کے عزت نفس کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں۔

شبلی پان اسلام ازم کے سخت حامی تھے۔انہوں نے انگریزوں اور دیگر مغربی طاقتوں کی مذمت کرتے ہوئے نظمیں اور مضامین لکھے۔ جب ترکی کو بلقان کی جنگوں میں شکست ہوئی اس وقت انہوں نے عالمی مسلمانوں کو متحد ہونے کی تلقین

یادرفتگاں

کی۔1913 میں جب ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ نے کانپور کی مسجد پر دھاوا بولا تو شبلی نے اس کی مذمت کی۔

علی گڑھ تحریک: بعض علماء کے مطابق شبلی علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے۔انہوں نے سرسید کے نظریے کی مخالفت کی اور اسی وجہ سے انہیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی خدمات سے روک دیا گیا۔کملیشور نے ایک ناول 'کتنے پاکستان' لکھا تھا اور اس ناول میں اس نے مولانا شبلی نعمانی کو ایک تنگ نظر مسلم مذہبی ماہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ایک اور کتاب 'اتاترک فی کربلا' از ڈاکٹر عارف الاسلام میں مصنف نے الزام لگایا ہے کہ شبلی سرسید کی پالیسیوں اور نظریات سے خوش نہیں تھے اور علی گڑھ تحریک کے خلاف سخت سے ملوث تھے۔شبلی اور سرسید کے درمیان کسی اختلاف کا ثبوت نہ تو سابقہ تصانیف میں ہوتا ہے اور نہ ہی بعد میں آنے والے کی زندگی کے دوران ہونے والی خط وکتابت میں۔شبلی کا پہلا تنقیدی حوالہ سرسید کی طرف نہیں بلکہ الطاف حسین حالی کی طرف ''حیات جاوید'' کے حوالے سے ہے جسے شبلی نے ''سراسر مدح سرائی'' کہا ہے۔یہ صرف بعد میں تھا، یعنی 1907 کے بعد جب شبلی نے 'علی گڑھ کالج' اور کبھی کبھار اس کے بانی سرسید کے بارے میں بہت سے تنقیدی حوالہ جات بنائے۔

ان تحریروں سے اس رویہ کی تبدیلی کے لیے شیخ اکرام کے بیان کردہ اسباب سے اتفاق ہوتا ہے۔ وہ یہ ہیں:

(الف) شبلی کی خواہش یہ ظاہر کرنا کہ ندوہ کا روایت پسند ماڈل علی گڑھ سے برتر تھا۔

(ب) شبلی کا ابوالکلام آزاد سے پیار اور بھروسہ جو علی گڑھ اور سرسید سے الرجک تھے۔ 'الہلال' اخبار کے بنیادی مقاصد میں سے ایک "علی گڑھ کے ایوانِ غلامی کو گرانا" تھا۔ شبلی اور آزاد کی خواہش ہے کہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے فروغ دینے والے آل انڈیا سے الحاق شدہ دائرہ اختیار کا مطالبہ ترک نہ کریں۔

(ج) شبلی اور وقارالملک کے درمیان نظریات پر اتفاق کا فقدان۔شبلی کو محسن الملک سے گہری محبت تھی جنہوں نے شبلی کو انجمن ترقی اردو کا پہلا سکریٹری مقرر کیا تھا جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذیلی ادارے کے طور پر شروع ہوئی تھی۔

(د) شبلی پر بمبئی کے مسلمان خاندانوں کا اثر۔ یہ مسلمان خاندان انڈین نیشنل کانگریس پارٹی کے نظریے کے موافق تھے۔ انہیں 'کانگریس کے حامی' لوگ کہا جاتا تھا۔

میراث اور بچ جانے والے:

شبلی کا ایک بیٹا حامد حسن نعمانی تھا۔ یہ بیٹا 1882 میں پیدا ہوا اور 1942 میں انتقال کر گیا۔ان کا ایک اور بیٹا تھا جو پیدائش کے فوراً بعد مر گیا، اور حسب ذیل پانچ بیٹیاں تھیں:

ا۔ ڈاکٹر نسیم جہاں، ریٹائرڈ ڈائریکٹر ہیلتھ، بنگلہ دیش، کا انتقال 1994 میں کراچی میں ہوا۔ان کی شادی 1940

اردو فن کاں

میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ظفر الہدیٰ سے ہوئی۔ ان کا انتقال 1978 میں ڈھاکہ میں ہوا۔ ان کی ایک بیٹی ہے۔

۲۔ شمیم جہاں (2005 میں کراچی میں فوت ہوئیں) نے 1940 میں احتشام احمد سے شادی کی جو 1982 میں انتقال کر گئے۔ ان کے آٹھ بیٹے اور سات بیٹیاں ہیں۔

۳۔ تحسین جہاں کی شادی 1940 میں شبلی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل شوکت سلطان سے ہوئی۔ انہوں نے پاکستان میں سکونت اختیار کی۔ ان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔

۴۔ محسنہ سلطانہ کی شادی 1950 میں امان اللہ خان، ڈائریکٹر آف انڈسٹریز، اترپردیش، انڈیا سے ہوئی۔ ان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

۵۔ مومنہ سلطان کی شادی 1952 میں کیپٹن خان سہیل سلطان سے ہوئی۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔

پاکستان پوسٹل سروسز نے 1992 میں اپنی 'Pioneers of Freedom' سیریز میں علامہ شبلی نعمانی کے اعزاز میں ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔

علامہ شبلی کے علمی و تصنیفی کام:

شبلی مغرب میں سائنس اور تعلیم کی ترقی سے بہت متاثر تھے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے کھوئے ہوئے ورثے اور ثقافت کا سہارا لے کر اسی طرح کی ترقی کی ترغیب دینا چاہتے تھے، انہوں نے مسلمانوں کو مغربی ثقافت میں گم ہونے سے خبردار کیا تھا۔'' بالآخر، ندوہ نے مغرب اور مشرق علم کو یکجا کرنے کے اپنے تصورات کو ترک کر دیا اور اسلامی اسکالرشپ اور اردو میں سوانحی اور تاریخی تحریروں کی اشاعت پر توجہ دی۔ شبلی کی اپنی تحریروں نے مؤخر الذکر کے لیے نمونہ قائم کیا۔'' اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے درج ذیل کتابیں لکھیں۔

☆ **''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'':** علامہ شبلی نعمانی نے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا لیکن 1914 میں ان کا انتقال ہوگیا، پھر ان کے شاگرد سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل کی ذمہ داری سنبھالی اور آخرکار یہ کتاب مکمل کی۔

☆ ''سیرت النعمان''

☆ ''الفاروق'' (خلیفہ عمر فاروق کی سوانح عمری)

☆ ''المامون''

☆ ''الغزالی'' (امام الغزالی کی سوانح عمری)

☆ امام ابن تیمیہ (ترمیم محمد تنزیل الصدیقی الحسینی)،

☆ مولانا رومی (مولانا رومی کی سوانح عمری)

☆ اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی زندگی پر ایک کتاب (1707-1658)

☆ ''شعر العجم'' فارسی شاعری کی تاریخ

☆ ''علم الکلام'' مسلم الہیات کی تاریخ پر بہترین کتاب

☆ ''سفرنامہ روم و مصر و شام''۔ 1892 میں اپنے اسکالر ساتھی تھامس آرنلڈ کے ساتھ روم، مصر، شام اور ترکی کا سفرنامہ ترتیب دیا۔

☆☆☆

یاد رفتگاں

پروفیسر مغنی تبسم

حیدرآباد دکن میں اردو تحقیق وتنقید کی خوب آبیاری کی گئی ہے اور کئی لوگوں نے تنقید اور تحقیق میں وسیع و وقیع کارنامے انجام دئے ہیں، پروفیسر مغنی تبسم کا شمار بھی ممتاز محققین و ناقدین میں ہوتا ہے۔ان کے ادبی کارناموں میں تخلیق، تنقید اور تحقیق شامل ہیں۔انہوں نے تنقیدی کارناموں کے عوض ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی ہے۔ان کے تنقیدی نظریات اور شعری تخلیقات اردو کے فروغ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ڈاکٹر زور نے لسانیاتی تنقید کو متعارف کروایا تھا، مغنی تبسم نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔وہ تنقید میں لسانیاتی نقاد مانے جاتے ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم 13 جون 1930 کو حیدرآباد کے محلے شکر کوٹہ میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام محمد عبدالمغنی اور قلمی نام مغنی تبسم تھا۔والد محترم کا نام محمد عبدالغنی اور والدہ کا نام حلیمہ بیگم تھا۔ان کے والد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ و سب جج کے عہدے پر فائز رہے۔آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ تحتانیہ چیلہ پورہ مدرسہ تحتانیہ جوگی پیٹ مدرسہ تحتانیہ یلاریڈی مدرسہ وسطانیہ اردو شریف حیدرآباد اور ہائی اسکول میدک میں ہوئی۔پھر دارالعلوم ہائی اسکول حیدرآباد سے 1946 میں میٹرک پاس کیا۔ 1948ء میں دارالعلوم سے انٹر کیا۔انٹر میں مضمون اختیاری اردو۔فارسی اور معاشیات لئے تھے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے 1950ء میں بی اے کیا، اس کے بعد 1952 میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ 1961ء میں ایم اے فارسی کی ڈگری لی۔ 1962ء میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں فانی بدایونی شخصیت اور فن پر ڈگری حاصل کی۔ ان کا مقالہ ''فانی بدایونی حیات ۔شخصیت اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' بہت مشہور ہوا جسے تحقیق کی دنیا کا معیاری مقالہ کہا جاتا ہے۔یہ مقالہ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔اردو دنیا میں اس تحقیقی مقالے کو بہت زیادہ فوقیت ملی۔

مغنی تبسم کا 1958ء میں جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ 1990ء میں بہ حیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئے۔انہوں نے UOH میں بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پروفیسر مغنی تبسم کے شاگرد زندگی کے مختلف شعبوں میں اعلی عہدوں پر فائز ہیں۔ان کے لکچر دینے کا انداز منفرد تھا۔ جملے بصیرت آمیز وفکر انگیز ہوا کرتے تھے۔ لہجہ میں متانت تھی۔سوچ سمجھ کر point to point موضوع سے متعلق relevant لکچر دیا کرتے تھے۔ انہیں انگریزی ادب پر بھی عبور تھا۔وہ اپنے لیکچرس میں انگریزی ادبیات کے حوالے بھی دیتے تھے۔ انہوں نے ورنگل میں جز وقتی درس وتدریس کی خدمات بھی انجام دیں۔ مغنی تبسم بچپن سے نفاست پسند اور وضع دار تھے، سوٹ بوٹ اور کالی عینک پہنا کرتے تھے، کالج کے دنوں میں کمیونزم سے

یادرفتگاں

متاثر ہوئے پھر ترقی پسند تحریک کے ہمنوا رہے۔ پھر جدید ادب و جدیدیت سے جڑ گئے' بعد میں ترقی پسند نقاد کہلائے۔ ان تینوں رجحانات کا اثر ان کی شاعری اور نثر میں نظر آتا ہے۔ ان کی حسب ذیل تصانیف جن میں تخلیق' تحقیق' تنقید اور تراجم کی صفات وخصوصیات نظر آتی ہیں۔

شعری مجموعوں میں نوائے تلخ 1946 ' پہلی کرن کا بوجھ 1980 ' مٹی مٹی میرا دل 1991 ' درد کے خیمے کے آس پاس 2002۔

تنقیدی کتابوں میں بازیافت 1969 ' آواز اور آدمی 1992 ' لفظوں سے آگے 1993 شامل ہیں۔

فانی حیات شخصیت اور شاعری 1969ء ؛ سوانح میں فانی بدایونی پر ساہتیہ اکیڈمی کیلئے ایک مقالہ 1993ء میں لکھا۔ فانی کی نادر تحریریں 1970 ' فکر اقبال 1977 ' کہانیاں 1983 ' انگریزی میں معاصر ہندوستانی کہانیاں 1996 ' عصری ہندوستانی کہانیاں' دکنی لغت و تذکرہ' دکنی مخطوطات از آغا حسن حیدر 2002 'ہندوستانی مسلمان سیاسی منزل کی تلاش 2003 ' ترجموں میں کہانی اور اس کا فن 1957 ' شادی کی آخری سالگرہ 1975 ' تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر 1956 ' نکات اردو 1956۔

آپ نے ملک کی حسب ذیل جامعات میں ادبی موضوعات پر توسیعی خطبات دیئے ہیں:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' جامعہ اردو علی گڑھ' یونیورسٹی آف حیدرآباد' یونیورسٹی آف میسور' ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی' بمبئی یونیورسٹی' ہندی اکیڈیمی اے پی۔

حسب ذیل بیرون ملک یونیورسٹیوں میں مغنی تبسم صاحب کے خطابات ہوئے:

اردو مرکز لندن' اردو شعر و سخن۔ علمی مجلس لندن' اردو کی بہ حیثیت مادری زبان تعلیم امیر خسرو سوسائٹی شکاگو' دکنی غزل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا۔

ان کی ادبی' شعری' تحقیقی وتنقیدی خدمات پر حسب ذیل اداروں سے اعزازات دیے گئے۔

آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی سے کارنامہ حیات ایوارڈ' بہار' مغربی بنگال' آندھرا پردیش کے میڈونا ٹرسٹ' بابل ریڈی فاونڈیشن حیدرآباد' پوٹی سری راملو تلگو یونیورسٹی حیدرآباد' ساہتیہ اکیڈیمی' غالب ایوارڈ 2017 میں فروغ اردو ایوارڈ دوحہ قطر عطا کیا گیا۔

ان کی تنقید میں عملی تنقید کے نمونے کے علاوہ لسانیاتی اور محاکے و تجزیے مل جاتے ہیں۔

صوتیاتی تنقید پر ان کی اچھی گرفت تھی۔ قافیہ کے موقف پر ان کی عمیق نظر تھی۔ علم عروض سے بھی اچھی آگہی حاصل تھی۔ مصوتوں اور مصمتوں پر انہیں عبور تھا۔ وہ ایک بہترین شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کا آہنگ دھیما اور لہجے میں سرگوشی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں دلی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے ایک منفرد انداز کی شاعری کی ہے۔ وہ لفظ کو بہت اہمیت دیتے ہیں:

کل میرے لفظوں میں میری جان رہے گی
دنیا یہ دیکھے گی تو حیران رہے گی

جناب مغنی تبسم کی خدمات کا دائرہ بہ حیثیت صحافی بہت وسیع ہے۔ وہ مختلف ادبی رسالوں کے مدیر رہے اور مجلس ادارت و مجلس مشاورت سے وابستہ رہے ہیں۔ شبستان ادب کے رکن ممبر ادارت ماہ نامہ صبا کی مجلس ادارت کے رکن' شش ماہی شعروحکمت۔ سوغات اور سب رس کے مدیر رہے۔ دو ماہی شعور کے بھی مدیر رہے۔ بہر حال اپنے کردار سے انہوں نے حیدرآباد کی ادبی صحافت کو بلندیوں تک پہنچادیا۔ ان کے شعروحکمت کے ضخیم شمارے نہ صرف تحقیق وتنقید میں حوالہ جات کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ انہیں پاکستان اور دیگر مما لک کی جامعات میں نصاب میں شامل کیا گیا۔ اردو ادب میں مغنی تبسم ہمہ جہت مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کے ایک ماہر استاد' شاعر' نقاد' محقق' صحافی ' افسانہ نگار' مترجم وغیرہ کی حیثیت سے اپنی علحدہ شناخت بنائی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہوں نے جو کام چھوڑا ہے نسلِ نو اسے مشعل راہ بنائے اور اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے سلسلہ میں ایسے محققین واساتذہ کرام کی محنتوں کی قدر کرے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ناظم علی
سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج
موڑتاڑ ضلع نظام آباد

احمقوں کی تلاش

ایک بادشاہ نے اپنے سب سے قابل وزیر کو کہا کہ اسکی مملکت میں سے چار احمق ترین لوگوں کو ایک مہینے میں تلاش کر کے اس کے حضور پیش کیا جائے' ایک مہینے کی جدوجہد کے بعد وزیر نے صرف دو احمقوں کو پیش کیا' بادشاہ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تو چار احمقوں کو پیش کرنے کا کہا تھا' وزیر نے کہا مہاراج، مجھے ایک ایک کر کے احمقوں کو پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ وزیر نے پہلا احمق پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ بڑا احمق اس لیے ہے کہ بیل گاڑی میں سوار ہونے کے باوجود اس نے سامان اپنے سر اٹھایا ہوا تھا' دوسرے احمق کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص کے گھر کی چھت پر بیج پڑے تھے' ان بیجوں کی وجہ سے چھت پر گھاس اگ آئی' یہ شخص اپنے بیل کو لکڑی کی سیڑھی سے چھت پر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بیل چھت پر چڑھ کر گھاس چر لے۔ وزیر نے کہا مہاراج، بطور وزیر مجھے اہم امور سلطنت چلانے تھے مگر میں نے ایک مہینہ احمقوں کی تلاش میں ضائع کیا اور صرف دو احمق تلاش کئے' اسلئے تیسرا احمق میں خود ہوا۔۔ وزیر نے ذرا سا توقف کیا تو بادشاہ چلایا کہ چوتھا احمق کون ہے۔۔؟ ؟ وزیر نے عرض کیا کہ مہاراج جان کی امان پاؤں تو عرض کروں' بادشاہ نے کہا کہ کہو' تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس نے کہا کہ مہاراج، آپ بادشاہ وقت ہیں اور تمام رعایا اور سلطنت کے امور چلانے کے ذمہ دار ہیں مگر قابل ترین اور اہل افراد کو تلاش کرنے کی بجائے آپ نے احمق ترین لوگوں کو تلاش کرنے میں نہ صرف اپنا وقت برباد کیا بلکہ ایک اہم وزیر کا وقت بر باد کیا لہٰذا چوتھے احمق آپ ہیں۔

یادرفتگاں

لسان العصر اکبر الہ آبادی اور اثبات و نفی

اکبر حسین رضوی، اکبر الہ آبادی کا نام آتے ہی سب سے پہلے ہمارے ذہنوں میں وہی غلط اور مکروہ منظر اور تصور ابھرتا ہے جس میں ایک شخص کرسی عدالت پر بیٹھ کر یا سرکار انگلشیہ بہادر کی ملازمت کرتے ہوئے بھی قدیم اقدار کا دلدادہ ہے، جدیدیت اور نئے پن سے بالکل نابلد ہے یا رہنا چاہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا دشمن ہے جو قوم کا بھلا اور انھیں نئی روشنی سے واقف کرانا چاہتے ہیں یا اس جانب کھینچ کر لاتے ہیں۔ وہ ایسے شریف، ہمدرد ان قوم اور نیک طینت لوگوں کی مخالفت دشمنوں سے بھی زیادہ شدومد سے کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب، قوم انگریز، لندن، کلب، پب وغیرہ سے دور رہنے اور بچنے کی تلقین اور سخت ہدایات کرتا ہے۔ نیز جو موقع و حالات شناس افراد، بہ نیت مصلحت و حکمت، ان سب چیزوں کو ہندوستانی اقوام کو اپنانے اور اختیار کرنے کی عادتیں ڈال رہے ہیں' قوم پر آئی نکبت و مصیبت سے نجات کا حل ان کی تابع داری اور روش کے اختیار میں کرنے میں سمجھ رہے ہیں، یوں وہ مصلحین قوم یا ریفارمر بن گئے ہیں۔ ان ہی نجات دہندگان اور قوم کی کشتی کو طوفانوں سے سلامت نکالنے والوں کو وہی شخص، کڑے لفظوں میں سخت وست، انگریزوں کا غلام، ان کی تہذیب سے متاثر و مرعوب اور ان کے کلچر کو ہندوستانی و مشرقی کلچر پر فوقیت دینے والا کہہ کر ان کا تمسخر اڑا رہا ہے اور انھیں غیر فطری نام دے کر ان پر طرح طرح کی بہتان تراشیاں کر رہا ہے۔ نیز انھیں ہدف تنقید بناتے ہوئے ان پر بے رحم تنقیدیں بھی کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ جدیدیت اور تبدیلی کا بھی سخت مخالف ہے جو کہ ہر قوم اور ملت کا بنیادی عنصر ہوتا ہے اور ایسا طریقہ، جو صدیوں سے رائج ہے وغیرہ۔ مزید یہ تاثرات اس شخص کے تئیں، مقابل تحاریر و تقاریر اور غلط پروپیگنڈوں سے بھی مضبوط ہوتے جاتے ہیں۔ مگر جب ان غلط فہمیوں اور مغالطوں کی چادریں ذہن سے ہٹتی جاتی ہیں اور جب ہم سچائی کا آئینہ لے کر اس حقیقت کی دریافت کرتے ہیں تو اس شخص کی فکر صحیح، نگاہ دور بیں، اس کی آگہی و معاملہ فہمی تک رسائی کے دروا ہوتے چلے جاتے ہیں اس وقت وہ شخص قوم کا سچا ساتھی اور ہمدرد نظر آتا ہے اور ان اداروں کا حامی بھی، جو اصلاح قوم اور انگریزوں کے مشن کے پیامبر تھے۔ نیز ان کے متعلق ماقبل میں کہی گئی سب باتیں جھوٹ اور غلط پروپیگنڈہ ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے خلاف سازش لگتی ہیں یا ایک خاص ذہن کی پیداوار، جن کا حقیقت سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ نیز جب ہم ان کا مزید گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں تو وہ اس طرح کے قومی ناصح اور ہمدرد کے روپ میں نظر آتے ہیں:

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا جو لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے

یادِ رفتگاں

غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ، تکلیفیں اٹھا
روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

یا پھر

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے، اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو

مذکورہ بالا قطعات کو بار بار اور کئی بار پڑھنے سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ وہ شخص ان اشعار میں یہی کہتا نظر آتا ہے کہ ناعاقبت اندیشو! انگریز پرستی، انگریزیت، ان کی صاحب گری یا وضع قطع کے بجائے ان کا ہنر سیکھو، ان کے درمیان میں اٹھ بیٹھ کر اور ان کے سنگ رہ کر جہاں بانی، ترقی، عروج، حکمرانی اور کامیابی کے رازوں سے واقف ہونے کی کوششیں کرو۔ ان کا طرز زندگی اپنانے کے بجائے اس کیمیا کو تلاش کرو جو خاک سے سونا بناتی ہے؛ وہ جوہر ڈھونڈو جو اُن کے ہاتھ لگ گیا اور تمھارے نہیں۔ مگر اسے بہ یک نظر غلط اور مخالف سمجھ لیا گیا۔ اکبر الہ آبادی کے اس انداز بیاں کو مصلحت پسندی، بیداری، انقلاب اور تبدیلی کا مخالف مان کر ان کی مذمتیں شروع کردی گئیں اور ان کے خلاف باضابطہ محاذ آرائیاں بھی۔ ''قوم'' نے اکبر کی ان نصائح کو قبول کرنے کے بجائے ''صاحب'' کے سوٹ، بوٹ، ٹائی، پن، کانٹے چمچ، اسٹک، ہیٹ، سگریٹ، وہسکی، ادا، چال چلن، نشست و برخاست کے انداز وغیرہ سب اپنا لیے، چنانچہ وہ پھر بھی ہونق کے ہونق ہی بنے رہے کیوں کہ وہ ''صاحب قوم'' کے ہنر سے عاری تھے۔ مزید سوٹ بوٹ اور ٹائی میں بدنما بھی نظر آنے لگے۔ اکبر کو 'رجعت پسند' کہنے والوں اور مخالفین پر یہ حقیقت بہت جلد آشکار ہوگئی، یوں وہ نوائے اکبری پر دھیان دینے کا من بنانے لگے مگر تب تک تو خدا بھی ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وصال صنم کی راہیں بھی مسدود ہوگئیں تھیں۔ اکبر اپنی روش پر رواں دواں رہے اور دوست نما رقیبوں سے شکوہ کناں رہے:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر کو یہ بھی ناز رہا:

نشان شوکت و گاندھی کجا بود
کہ اکبر صرف کشف ماجرا بود
بجائے ملک لیکن مدعایش
خدا بود و خدا بود و خدا بود

اس تمہید بلیغ کے بعد مدعا اور بیان واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی تنقیدی وفکری بازیافت مقصود ہے کہ کیا واقعی اکبر قوم پرست تھے یا لوگوں کا ہی کہا درست ہے؟ یہ سوالات اس وقت مزید سنجیدگی اختیار کر لیتے ہیں کہ جب ہم اکبر کی عملی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ ''صاحب قوم'' کے نمک خوار رہے اور اس کی چاکری میں عمر گزار دی۔ پھر اُن کے یہ تیور چہ معنی دارد؛ جن سے انگریزوں کی مخالفت اور اپنے حاکموں سے خصومت مترشح ہے؟ ممکن ہے یہ گہری بات ہو،

مگر اسے نقطۂ نظر اور اسلوب کے اظہار سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جس نے عام ہندوستانیوں کو گمراہ کیا یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بڑے ظرف اور دانش ور انگریز اکبر کے ادیبانہ طنز و تمسخر میں اپنے اقتدار اور تہذیب کے لیے کسی قسم کا خطرہ نہیں محسوس کررہا تھا بلکہ وہ اسے محض لٹریچر یا ادبیات کا ایک حصہ مان کر اپنے امور میں مصروف تھا۔ اس سے اکبر کو شہہ ملتی گئی اور اب وہ نیک ٹو نیک اور فیس ٹو فیس آ گئے ۔ جسے اردو میں ''منہ آنا'' کہتے ہیں۔ مگر انگریز نے اس کا بھی برا نہیں منایا؛ کیوں کہ وہ صورت حال کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ باوجود اس کے، اکبر کی قوم پرستی مشکوک نہیں ہے، قوم کے لیے کیے گئے ان کے کارنامے ایسے نہیں کہ انھیں یکسر فراموش کردیا جائے۔ اگر کوئی کالج یا مدرسہ قائم کرکے یا انگریزوں کی امداد سے کوئی ادارہ قائم کرکے قوم وملت کی خدمت کررہا تھا تو اکبر بھی اپنے ملکۂ ہنر سے یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔ چوں کہ قوم ہندوستانی ومسلمانی، اس وقت حالات کے ایسے ہی دھارے میں پھنس گئی تھی؛ جسے نکالنے کے لیے ہر جانب سے مہمات و کوششیں کرنی تھیں اور دانشوران قوم کے کاندھوں پر اس کی ذمے داریاں عام افراد سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔ اکبر الہ آبادی کو اس فرض کا احساس تھا اس لیے اس نے انگریزوں کے زیرسایہ رہ کر نغمۂ قوم گایا اور فریبی انگریز کو اسی کے بالمثل فریب دینے میں کامیاب رہے۔ یہی اکبر کا وہ نقطۂ نظر تھا اور یہی مدعا بھی، جس کی راہ پر وہ ہندوستانیوں کو بھی گامزن کرنا چاہتے تھے۔

قطع نظر ماقبل مذکور تمام خیالات ونظریات کے، جب ہم اکبر کے ادب اور شاعری یا طنز ومزاح سمیت دیگر شعری وفکری خصوصیات پر بات کرتے ہیں تو ان میں بھی ان کی تنقیدی بازیافت یا اکبر کے اثبات ونفی کے در، ہم پر کھلتے ہیں۔ یہیں پر یہ سوال بھی جنم لیتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ ہم اکبر کو صرف اسی چشمے سے دیکھتے ہیں یا دیکھنا چاہتے ہیں جس سے علی گڑھ زدہ نقاد اور کچھ دنیاوی یا زردار تنقید نگار دیکھتے ہیں' یا ہم ان کی مخالفت کرتے ہوئے اکبر کو حضرت مولوی کیوں بنا دینا چاہتے ہیں؟ کیوں نہ ہم ان کی شاعری اور فکر محض کا ہی مطالعہ کریں؟ اس سوال کا تشفی بخش جواب تو نہیں ملتا البتہ دل کے اندر سے یہ داعیہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ لو ہم ہی ان کی شاعری اور فکر محض کا مطالعہ کریں اور ہم ہی اس تعمیر ادب کی خشت اول ثابت ہوں ۔ چنانچہ اسی فکر اور اسی داعیے کے تناظر میں اکبر کی ایسی ہی تنقیدی بازیافت مقصود ہے جو اُن کا علمی اور ادبی مقام متعین کرتے ہوئے اکبر کا مطالعہ نئی فکر سے کریں۔

سچ یہ بھی ہے کہ اکبر الہ آبادی کو ہم محض ایک چٹکلے باز یا تمسخر اڑانے والے شاعر کے ہی طور پر نہیں دیکھ سکتے (لاکھ وہ ان ہی حوالوں سے معروف ہوں) بلکہ اس کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں ایسے عناصر موجود ہیں جن پر تنقیدی نگاہ ڈالی جاسکتی ہے اور ان سے علم وادب میں اضافوں کا امکان پیدا کیا جاسکتا ہے؛ اسی طرح اس سے اکبر کی نئی صورت بھی ہمارے سامنے آسکتی ہے۔

اکبرالہ آبادی کاایک شعر ہے:

سردتھاموسم ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اکبرالہ آبادی اس شعر میں اپنی مجبوری، طنزومزاح کا اسلوب اختیار کرنے اور سرسید، حالی اقبال کی مانند کھل کر قوم کی حمایت اور ریفارمیشن ورک نہ کر پانے کا عذر بیان کررہے ہیں۔شاہد معنی وہ خود ہیں جوایوان حکومت سے ان تمام حالات کا بغور مطالعہ کررہے تھےمگرانھوں نے ظرافت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا کیوں کہ موسم بہت سرد تھا اورہوائیں برف بار چل رہی تھیں۔ایسے حالات میں ان کی جگہ کوئی اوربھی ہوتا تو شاید یہی کرتا؛لہٰذا یہ ان کا ایسا عذر ہے جو قابل قبول اورقابل غور ہے۔یہ طریقہ انھیں اپنے معترضین اور ناقدین سے بہت بلندی پر لے جاکرانھیں مہمیز کرتا ہے کہ وہ عہدقدیم وفرسودہ میں آنے والے نئے دور کی شاعری کریں آوازیں کسنے والوں، دامن کھینچنے والوں اوروبال جان بننے والوں کی کوئی پروانہ کریں۔پھر یہاں سے اکبر نے جوراہ چنی، وہی ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتی ہے اور اسی پرناقدانہ نگاہ ہمارا مدعا بھی ہے:

اکبرالہ ابادی کاایک بنداس طرح ہے:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھاکے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

اکبرالہ آبادی نے اپنے بیٹےعشرتی کولندن، ولایت تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا؛اس برخوردار نے جوتماشے کیے، انھیں اکبراپنے اس بند میں بیان کررہے ہیں۔[عشرتی کے کارناموں کواکبر نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے؛یہاں اس کی ایک جھلک پیش ہے]اس بند میں وہ عشرتی کے حیلے سے ہر ایسی وضع کے نوجوان کو ہدف تنقید بنارہے ہیں۔تاہم اس پربھی جب ہم تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تواکبرناقد وطناز کے بجائے ہمیں ایک اور ہی روپ میں نظرآتے ہیں۔وہ ایسے منصف نظرآتے ہیں جوفیصلہ کرتے وقت جرم ودلیل سننے کے بعداپنے خون سے بھی رعایت نہیں کرتے اورحق سچ فیصلہ کردیتا ہے۔لیکن باوجوداس کے بھی ان اشعار کے بین السطور میں موجود بیٹے کے لیے شفقت صاف نظرآتی ہے۔اگریہیں کسی اور کا بیٹا ہوتا تواکبر کے تیورمختلف ہوتے۔وہ گھر کی محبت کے بجائے 'ماں باپ کی محبت' کہتے، ہوٹل میں عید کے بجائے کسی اورتقریب کا ذکرکرتے، تیسرے شعر میں بھی وہ کچھ اورقافیہ پیمائی کرتے۔مگر یہاں معاملہ ہی دیگر ہے۔انھوں نے بیٹے کی محبت میں الفاظ کا چناؤ بھی اس قسم کا کیا جوخوب صورت معانی اورجہات اپنے جلو میں رکھتے ہیں اوردوسرے کےتئیں شکوک کوجگہ دیتے ہیں۔ایک اورمشہورشعردیکھیے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس شعر میں اکبر کا لہجہ اور تیور دونوں سخت بھی ہیں اور توہین آمیز بھی۔ وہ کالج کے علم وتعلیم کو محض اس لیے فرعون کے قتل صبیان سے ملا رہے ہیں کہ یہاں کی کھلی فضاؤں میں طلبا وطالبات اکثر آوارہ ہوجاتے ہیں،ان کا ادب واخلاق غارت ہوکررہ جاتا ہےاوراس کی جگہ اخلاقی بحران، غلامانہ ذہنیت، مفاد پرستی اور دین واقدار سے دوری لے لیتی ہیں اور پھر ان کا جینا مرنا برابر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور وجہ اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنے اس اعتراض کا کوئی اورسبب بتا سکتے ہیں یا انھوں نے بتایا ہی ہے۔یوں وہ کالج کواوراس کی تعلیم کوفرعونی عمل یعنی قتل صبیان سے تعبیر کررہے ہیں۔حالاں کہ اس کا جو فیضان ہے وہ جگ ظاہر ہے۔کالج گو ایک استعارہ ہی سہی،مگر اس کے ایسی درس گاہ ہونے سے انکارممکن نہیں جہاں قوموں اورافراد کی تقدیریں سنورتی ہیں۔اکبرکو یہاں کالج کے فوائد مدنظر رکھنے تھے جو دائمی ہوتے ہیں،وہ وقتی صورت حال کے قائل ہوگئے یوں ان کا کلام اوران کی فکر دونوں ہی قابل اعتراض ٹھہرے۔ اکبرکے یہاں کچھ اصلاحی نکات پیش کرسکتے تھے اور کچھ ایسی ہدایات یا رہ نماں اصول بتلادیتے جن سے وہ صورت حال تبدیل ہوسکتی تھی۔تعلیم ایک تہذیب کا عنوان ہے، نیز تعلیم ہر اس راہ سے مستعار ہے جو ترقیوں کی جانب لے جاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کا کسی ایسے فعل سے جوڑ ملانا جو قبیح اور شنیع ہو، وہ مناسب نہیں۔قتل تو فنا ہےاور کالج/ تعلیم زندگی ہے۔

اشعار اکبر میں ہمیں کچھ مزید اشعار بھی ایسے ملتے ہیں جو مثبت تشریح طلب ہیں،ممکن ہے انھیں اکبر کی تنقید کہا جائے،مگر ان کا اثبات اکبر کے حق میں ہی ہوگا:

کچھ نہیں کار فلک حادثہ پاشی کے سوا
فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا

OOO

اگر مذہب خلل انداز ہے ملکی مقاصد میں
تو شیخ وبرہمن پنہاں رہیں دَیر ومساجد میں

کاردنیا ہی نہیں، کار فلک بھی ایک حادثے کا نتیجہ ہے۔یعنی یہاں کچھ بھی ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی حادثے کے سبب ہی ہوتا ہے۔کوئی شدید ضرورت یا اتفاق کسی چیز کو وجود میں لانے کا باعث بن جاتا ہے۔اسی طرح فلسفہ،کیا ہے فلسفہ،الفاظ کا ایک گورکھ دھندہ ہوتا ہے۔ زیست ،مسائل زیست،سماج ،رہن سہن کے علاوہ دیگر معاملات میں انسان کچھ مفروضے، کچھ تصورات اور کچھ غیر حقیقی چیزیں سوچ لیتا ہے۔وہی چیزیں بعد میں فلسفہ بن جاتی ہیں۔

دوسرے شعر میں تو اکبر جو بات کہتے ہیں اس سے اتفاق اور اختلاف دونوں ہی کیے جاسکتے ہیں۔اتفاق کی صورت میں یہ لازم آئے گا کہ ملکی مقاصد میں مذہب خلل انداز ہوتا ہے اور دوسری صورت میں یعنی اختلاف کی صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مذہب ملکی معاملات کے لیے ضروری ہے اور نسخۂ اکسیر بھی۔اول صورت میں شیخ وبرہمن کو مسجد ودَیر تک ہی محدود رہنا ہوگا اور دوسری صورت میں انھیں علم حق واصلاح لے کر میدان میں آنا ہی ہوگا۔

مذکورہ خیالات اوراشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اکبر کے یہاں منافقت نہیں ہے۔کسی بھی مسئلے میں وہ دوہرا معیار نہیں رکھنا چاہتے ،کسی بھی صورت نہیں؟ خواہ خود کے لیے ہوخواہ کسی اور کے لیے۔مذہبی رہ نما کے لیے ہو یا پھر سیاسی اورسماجی رہ نما[ریفارمر] کے لیے۔

یہی مثبت ومنفی کیفیات اکبرالہ آبادی کے کلام اور حیات میں بکثرت موجود ہیں جو ان کے کلام اور وژن کو نہ صرف خوب صورت بناتی ہیں بلکہ اس کا تاثر بھی گہرا چھوڑتی ہیں۔اکبرکا اثبات ونفی بالعموم قوم،قومی خدمت،قومیت،قومی رہ نماؤں کی تعظیم،انگریز، انگریزیت، انگریز پرستی،انگریزی حکام جیسے موضوعات کے ارگرد ہی ہے۔اس میں شیخ وبرہمن اورسماج وملک کچھ اور دوسرے درجات کے افراد کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ استعارہ اور بلیغ ہوجاتا ہے اسی طرح اس کی معنویت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔

ایک بات جس کا اظہار سب سے ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اکبر کے تعلق سے جو غلط فہمیاں عام ہیں،ان کی حقیقت محض غلط فہمیاں ہی ہیں،اس سے آگے ان کی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ وجودیت۔اکبرکبھی بھی قوم کا بھلا اورفوزو فلاح چاہنے والوں کے مخالف نہیں تھے،انھیں کبھی ان رہنماؤں سے بغض یا بَیر نہیں تھا۔ان کا ازالہ ماقبل میں بھی کیا جاچکا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ یہی باتیں اس قدر عام اورمشہور ہیں کہ انھوں نے اکبر کے متفرق ناحیوں سے مطالعے کی راہیں مسدود کردی ہیں۔اب تو عالم یہ ہے کہ اکبر کا نام آتے ہی ایسا تاثر ہوتا ہے کہ جیسے کسی شاتم بزرگ کا نام لے لیا ہو۔بزرگ بھی ایسے جو قوم وملک،ملت و سلطنت کے بے لوث خادم تھے۔

•••

ماخذومراجع:

☆ کلیات اکبرالہ آبادی
☆ اکبرالہ آبادی:ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ
☆ اکبرالہ آبادی:حیات وخدمات
☆ علی گڑھ میگزین،علی گڑھ۔اکبرنمبر۔1950
☆ فکرونظر،نئی دہلی۔(جنوری،فروری،مارچ)2009
☆ نقوش،لاہور۔(ادبی معرکے نمبر)

☆☆☆

ڈاکٹرقسیم اختر
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، مارواڑی کالج،کشن گنج۔855107
موبائل:9470120116

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف' خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروارہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی' اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔
ادارہ قومی زبان

مہاتما گاندھی کی خودنوشت اوراس کے اردو تراجم

مہاتما گاندھی ہماری قومی تحریک کے سالار کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ صرف ایک سیاست داں ہی نہیں ،سماجی مصلح ،دانشور، مفکر اور ایک مخصوص فلسفۂ حیات کے بانی ومبانی کے طور پر بھی انسانی تاریخ کا جزو لاینفک ہیں۔گاندھی جی کی یہ دانشوری اوران کا یہ مخصوص فلسفۂ حیات جسے ہم فلسفہ عدم تشدد کے نام سے جانتے ہیں صرف ہم ہندوستانیوں تک ہی محدودنہیں رہا بلکہ عالمی سطح کے کتنے ہی مفکرین ودانشوروں نے گاندھی کی فکر سے اپنے فلسفے کا چراغ جلایاہے۔مارٹن لوتھر کنگ ہوں یا نیلسن منڈیلا دونوں کی فکر پر ہمیں مہاتما گاندھی کے افکارونظریات کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔گاندھی جی ایک بااصول سیاسی رہنمااور مفکر ہونے کے ساتھ ہی ایک ایماندارو بیباک شخص بھی تھے جو اپنی شخصی خامیوں اور کمزوریوں کا اظہارواعتراف کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے بعض سیاسی رفقائے کار کے اصرار پر اپنی خودنوشت لکھنے کا فیصلہ کیاتو خودکی شخصی کمزوریوں اور خامیوں کوبھی ایماندارنہ طور پر بے کم وکاست بیان کردیا۔گاندھی جی کی یہ خودنوشت اصلاً گجراتی زبان میں تصنیف کی گئی ہے جو مہاتما جی کی مادری زبان تھی۔گجراتی زبان میں تحریر کی گئی اس کتاب کا نام ہے''ستیہ نا پر یوگو اتھو آتم کتھا'' ہے۔گاندھی جی کی یہ تصنیف ان کے ہفت روزہ اخبار ''نوجیون'' میں 1925ء سے 1929ء تک قسط وار شائع ہوتی رہی۔گجراتی زبان سے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ مہاتما گاندھی کے دست راست مہادیو دیسائی نے کیاتھاجو گاندھی جی کے جاری کردہ انگریزی اخبار ''ینگ انڈیا'' میں قسط وار شائع ہوا تھا۔مہادیو دیسائی نے کتاب کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں وضاحت کی ہے کہ یہ ترجمہ مکمل طور پران کا کیا ہوانہیں ہے بلکہ اس کے انتیسویں باب سے لے کر تینتالیسویں باب تک کا ترجمہ دیسائی کے ساتھی پیارے لال نیر نے کیاتھا۔ دیسائی کے مطابق گاندھی جی کی گجراتی خودنوشت کا یہ انگریزی ترجمہ جوانہوں نے کیاہے دوجلدوں میں شائع ہوا ہے۔پہلی جلد 1927ء میں اور دوسری جلد 1929ء میں منظرعام پرآئی تھی۔اس انگریزی ترجمے کا عنوان ہے:

The Story of My Experiments with Truth

گاندھی جی کی تحریرکردہ اس خودنوشت کو دنیا کی بہترین''روحانی کتب'' میں شمار کیا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے اپنے کئی قریبی ساتھیوں بالخصوص سوامی آنند کے اصرار پراپنی خودنوشت لکھنی شروع کی تھی

جسے وہ اپنی دیگر مصروفیات کی بناء پر مکمل نہیں کر سکے۔ چنانچہ 1915ء تک کے واقعات کا احاطہ ہی اس کتاب میں کیا جا سکا ہے اور اسی سال ہونے والے کانگریس کے ناگپور اجلاس کے ذکر کے ساتھ ہی یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں موہن داس کرم چند گاندھی ان الفاظ میں کتاب کا سبب تصنیف بیان کرتے ہیں:

''میرا مقصد اس قسم کی کتاب لکھنا نہیں ہے جو آپ بیتی کہلاتی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں جو تجربے کیے ہیں ان کی کہانی سنا دوں، یہ سچ ہے کہ ساری عمر انہی تجربوں میں گزری ہے۔ اس لیے یہ کہانی آپ بیتی بن جائے گی۔ لیکن اگر کتاب کے ہر صفحے میں سوا ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں ایسی آپ بیتی لکھنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ اب چاہے یہ میرے نفس کا فریب ہو مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا ایک مسلسل بیان پڑھنے والوں کے لیے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ سیاست کے میدان میں جو تجربے میں نے کیے ہیں، وہ ہندوستان میں بلکہ ایک حد تک ''مہذب دنیا'' میں بھی مشہور ہو گئے ہیں، میری نظر میں نہ ان تجربوں کی کوئی وقعت ہے اور نہ ''مہاتما'' کے لقب کی جو ان کی بناء پر مجھے لوگوں نے دے رکھا ہے۔ مجھے اکثر اس لقب سے بہت دکھ پہنچا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے میرے دل کو نہیں لبھایا۔ البتہ ان روحانی تجربوں کو میں خوشی سی بیان کروں گا جو صرف مجھی کو معلوم ہیں اور جن کی بدولت مجھے سیاسی میدان میں کام کرنے کے لیے تھوڑی بہت قوت حاصل ہوئی۔ اگر یہ تجربے واقعی روحانی ہیں تو خودستائی کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ ان کا کچھ اثر میری ذات پر ہو سکتا ہے تو یہی کہ میری عاجزی اور بڑھ جائے۔ گزرے ہوئے زمانے پر میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اتنی ہی میری نارسائی مجھ پر کھلتی جاتی ہے۔''

(تلاش حق: مہاتما گاندھی، مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین، صفحہ 14)

گاندھی جی کی اس خود نوشت کے اردو میں دو ترجمے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ ایک ڈاکٹر سید عابد حسین نے ''تلاش حق'' کے نام سے کیا ہے اور جس سے ایک اقتباس اوپر دیا گیا ہے۔ دوسرا ترجمہ عائشہ شمس نے ''میری آپ بیتی'' کے عنوان سے کیا ہے اور جسے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCRT) نے 1970ء میں شائع کیا ہے۔ گاندھی جی نے اس کتاب میں اپنے خاندانی پس منظر، اپنے والدین، بچپن، شادی، والدین کے ساتھ اپنے رشتے اور تعلقات، ابتدائی تعلیم وغیرہ کے تعلق سے بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں جن سے ان کے زمانے کے حالات اور طرز معاشرت بالخصوص گجراتی طرز معاشرت پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ گاندھی جی نے انگلستان کے سفر اور قیام کے دوران ایک خالص انگریز ''جنٹل مین'' بننے کی اپنی کوششوں کا بھی ذکر

بے حد دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ میرے سامنے گاندھی جی کی یہ زبان گجراتی اس خودنوشت کا انگریزی ترجمہ ہے جو ان کے رفیق کار ودست راست مہادیو دیسائی نے The Story of my Experiments with Truth کے نام سے کیا ہے۔

گاندھی جی کی گجراتی خودنوشت کے انگریزی ترجمے The Story of my Experiments with Truth کا جونسخہ راقم الحروف کے سامنے ہے، اس پر مترجم کی حیثیت سے مہادیو دیسائی کا نام درج نہیں ہے۔ یہ کتاب 512 صفحات پر مشتمل ہے جسے بی پی آئی انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ نے 2012 میں شائع کیا ہے۔ اسے 168 عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جنہیں ابواب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کتاب گاندھی جی کی پیدائش سے لے کر 1920ء تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کتاب پر مہادیو دیسائی اور نیر کا نام درج نہیں ہے لیکن یہ ترجمہ انہی کا کیا ہوا ہے کیونکہ گاندھی جی کی اس گجراتی خودنوشت کا کوئی دوسرا انگریزی ترجمہ موجود نہیں ہے بلکہ عام طور پر لوگ اسے ہی اصل تصنیف سمجھتے ہیں۔ اسی انگریزی ترجمے سے ہی اس کتاب کے دیگر ہندوستانی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو میں اس کتاب کے دو ترجموں تک راقم الحروف کی رسائی ہوئی ہے اور میری تحقیق کے مطابق اردو میں یہی دو ترجمے موجود ہیں۔ پہلا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے ''تلاش حق'' کے نام سے کیا ہے اور دوسرا ترجمہ عائشہ شمس کا ہے جس کا عنوان ہے ''میری آپ بیتی'' اور جسے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCRT) نے 1970ء میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے شائع کی گئی ہے اور اسی کی مناسبت سے اصل کتاب کے صرف انہی حصوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جو بچوں کی عمر اور ذہنی سطح کے مطابق ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا ترجمہ البتہ ایک مکمل ترجمہ ہے جس میں اصل تصنیف کے کم وبیش تمام متن کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

سید عابد حسین 1896ء میں ضلع قنوج کے ایک قصبے داعی پور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگلستان اور پھر جرمنی کا رخ کیا۔ جرمنی کی برلن یونیورسٹی سے انہوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1926ء میں جرمنی سے واپسی پر سید عابد حسین نے اردو اور انگریزی ادب کے پروفیسر کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شمولیت اختیار کر لی اور خود کو جامعہ کی ترقی وفروغ کے لیے وقف کر دیا۔

عابد حسین ایک بے حد فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے علم وادب کے کئی شعبوں میں اہم کارنامے انجام دیے۔ وہ تخلیق کار بھی تھے اور مترجم بھی۔ انہوں نے ''پردۂ غفلت'' جیسا کامیاب ڈراما لکھا جو مسلم معاشرے کے ایک اہم مسئلے کی عکاسی پر مشتمل

ہے۔اس کے علاوہ ان کی ایک اور اہم ترین تصنیف ''قومی تہذیب کا مسئلہ اور ہندوستانی قومیت'' ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔''ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں'' بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے۔عابد حسین نے جرمن شاعر و ڈراما نگار گوئٹے کے شاہکار ڈرامے ''دی فاؤسٹ'' کو بھی اردو میں ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے اور بھی کئی اہم ترجمے کیے جن میں ٹی۔جے۔دو بوئر کی شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ فلسفۂ اسلام'' بھی شامل ہے۔دیگر تراجم میں مشہور فلسفی کانٹ کی تصنیف کا اردو میں ''تنقید عقل محض'' اور مہاتما گاندھی کی خودنوشت The Story of my Experiments with Truth کا اردو ترجمہ شامل ہے جس کا عنوان ہے ''تلاش حق''۔اس کے علاوہ ان کی اور بھی کئی تصانیف موجود ہیں۔سید عابد حسین کو ان کی جملہ خدمات کے لیے حکومت ہند نے 1957ء میں مشہور قومی اعزاز ''پدم بھوشن'' سے بھی نوازا۔ڈاکٹر سید عابد حسین کو عمر کے آخری حصے میں کینسر جیسی مہلک بیماری ہوگئی اور اسی بیماری سے 13 دسمبر 1978ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ہوئی۔

سید عابد حسین کے علاوہ The Story of my Experiments with Truth کی دوسری اردو مترجم عائشہ شمس ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا۔ان کا یہ ترجمہ مکمل کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ کتاب کے ان حصوں کا ہے جن سے واقف ہونا بچوں کے لیے ضرررساں نہیں تھا۔عائشہ شمس کے تعلق سے راقم الحروف کو معلومات بہم نہیں پہنچ سکیں اس لیے ان کی حیات اور دیگر علمی و ادبی خدمات نیز ان کے تراجم کے تعلق سے یہاں کچھ بھی کہنا ممکن نہیں ہے۔

جہاں تک دونوں ترجموں کا سوال ہے تو ذیل میں درج اصل عبارت اور اس کے دونوں تراجم کے مطالعے سے اس کا اندازہ قارئین خود کر سکتے ہیں کہ کس کا ترجمہ زیادہ بہتر ہے۔اس سلسلے میں یہ اہم بات بھی ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی ترجمہ پورے طور پر غلط یا صحیح نہیں ہوتا۔مترجم ایک حصے یا عبارت کا ترجمہ بہت اچھا کرتا ہے لیکن دوسری جگہ وہ کامیاب نہیں ہو پاتا۔یہاں چونکہ بات ہو رہی ہے ایک ہی کتاب کے دو الگ الگ ترجموں کی تو ظاہر ہے کہ یہاں دو مترجمین کی فنی مہارت اور بنیادی نیز ہدفی زبان پر ان کی گرفت کا اندازہ زیادہ بہتر طور پر لگایا جا سکتا ہے۔پیش ہے اصل متن اور اس کے دونوں ترجمے:

"A relative and I became fond of smoking. Not that we saw any good in smoking, or were enamoured of the smell of a cigarette. We simply imagined a

مضامین

pleasure in emitting clouds sort of of smoke from our mouths. My uncle had the habbit, and when we saw him smoking,we thought we should copy his example. But we had no money. So we began pilfering stumps of cigarettes thrown away by my uncle.'' .(*The Story of my Experiments with Truth, page No. 36)*

اب اس اقتباس کا وہ ترجمہ دیکھئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ہے:

''میرے ایک عزیز کو اور مجھے سگریٹ پینے کا چسکہ لگ گیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس عادت کو اچھا سمجھتے ہوں یا سگریٹ کی خوشبو پر ریجھے ہوں ۔ہمیں تو صرف منہ سے دھواں نکالنے میں ایک خیالی لطف آتا تھا۔ میرے چچا اس کے عادی تھے اور جب ہم انہیں سگریٹ پیتے دیکھتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ ان کی طرح ہم بھی پئیں مگر ہمارے پاس دام تو تھے نہیں اس لیے ہم نے ابتدا اس طرح کی کہ ہم سگریٹ کے ٹکڑے جو ہمارے چچا پی کر پھینک دیتے تھے، چرا لاتے تھے۔'' (تلاش حق: مہاتما گاندھی، صفحہ 53)

اسی اقتباس کا دوسرا ترجمہ ملاحظہ ہو جو عائشہ شمس نے کیا ہے:

''جب میں بارہ یا تیرہ سال کا تھا مجھے اور میرے ایک رشتہ دار کو سگریٹ پینے کا شوق ہوا۔ سگریٹ کی بو ہمیں پسند نہ تھی۔ ہم تو بس یہ سوچتے تھے کہ سگریٹ پینے سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ میرے چچا اپنے منہ سے دھوئیں کے بادل چھوڑتے تو ہم بھی سوچتے کہ ویسا ہی کریں۔ مگر ہمارے پاس پیسے نہ تھے اور ہم سگریٹ نہ خرید سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے چچا کے پھینکے ہوئے ادھ جلے ٹکڑے چرانا شروع کر دیے۔''

(میری آپ بیتی: مہاتما گاندھی، صفحہ 20)

دونوں ترجموں پر غور کیجئے ''جب میں بارہ یا تیرہ سال کا تھا'' یہ جملہ مترجم عائشہ شمس کا خود کردہ اضافہ ہے۔ اصل متن (انگریزی) میں یہ جملہ موجود نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ مترجم نے یہ اضافہ کیوں کیا؟ دراصل عائشہ شمس یہ ترجمہ بچوں کے لیے کر رہی تھیں اس لیے انہوں نے یہاں پر یہ وضاحت ضروری سمجھی کہ بچوں پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ واقعہ گاندھی جی کے بچپن کا واقعہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بچوں میں تجسس کا مادہ بڑوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے اور وہ بڑوں کو دیکھ کر انہی کی طرح بننا، دکھنا اور کرنا چاہتے ہیں۔ اردو ترجمے میں خود گاندھی جی کی زبان سے یہ جملہ بچوں کے لیے بے حد دلچسپی کا باعث بنتا ہے اور یہ پڑھ کر ظاہر ہے کہ انہیں لطف آئے گا کہ مہاتما گاندھی جیسی عظیم شخصیت بھی اپنے بچپن میں عام بچوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس کے برعکس سید عابد حسین کے ہدفی قارئین بچے نہیں تھے اس لیے انہیں ایسی کسی وضاحت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اب ایک اور اقتباس دیکھئے:

"During another *Chaturmas* she

wowed not to have food without seeing the sun. We children on those days would stand, staring at the sky, waiting to announce the appearance of the sun to our mother. Everyone knows that at the height of the rainy season the sun often does not condescend to show his face. And I remember days when at his sudden appearance, we would rush and announce it to her. She would run out to see with her own eyes, but by that time the fugitive sun would be gone, thus depriving her of her meal. "That does not matter" she would say cheerfully, "God did not want me to eat today." And then she would return to her round of duties."

(*The Story of my Experiments with Truth, page No. 16*)

ڈاکٹر سید عابد حسین کا ترجمہ دیکھئے:

''ایک بار اسی زمانے میں انہوں نے یہ نذر مانی کہ جب تک سورج نہ دیکھ لوں گی کھانا نہیں کھاؤں گی۔ ہم سب بچے ان دنوں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ سورج دیکھیں تو والدہ کو خبر کردیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب برسات کا موسم شباب پر ہوتا ہے تو سورج اکثر بے التفاتی سے منہ چھپالیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ یک بہ یک سورج کو بادلوں سے نکلتے دیکھ کر ہم بچوں نے دوڑ کر انہیں خبر دی، وہ دوڑی ہوئی آئیں کہ اپنی آنکھ سے دیکھیں مگر اتنی دیر میں سیماب وش سورج غائب ہوگیا اور انہیں کھانا نصیب نہ ہوا۔ مگر وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے یہی کہتی تھیں ''کوئی حرج کی بات نہیں، خدا کی مرضی نہ تھی کہ میں آج کھانا کھاؤں اور جاکر روزمرہ کے دھندوں میں مصروف ہوجاتیں تھیں۔''

(تلاش حق: مہاتما گاندھی، صفحہ 24)

عائشہ شمس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''ہم بہت چھوٹے تھے جب ایک ''چترماس'' میں انہوں نے قسم کھائی کہ سورج دیکھے بنا کھانا نہیں کھائیں گی۔ ہم باہر آسمان کی طرف نظریں جمائے کھڑے رہتے جیسے ہی سورج دکھائی دیتا ہم ماں کو پکارتے۔ کبھی کبھی بادلوں کی وجہ سے سورج بالکل ہی نظر نہ آتا۔ ایک بار سورج نکلتے ہی ہم نے ماں کو آواز دی لیکن جب تک وہ بھاگ کر آئیں سورج بادلوں میں چھپ گیا۔ پریشانی کے بجائے انہوں نے بڑی خوش دلی سے کہا ''کوئی بات نہیں، خدا کو منظور

نہیں کہ میں آج کھانا کھاؤں۔''

(میری آپ بیتی: مہاتما گاندھی، صفحہ 3)

دونوں ہی ترجے خوب ہیں، عائشہ شمس نے سید عابد حسین کے مقابلے میں قدرے اختصار سے کام لیا ہے۔ انہوں کئی جملوں کا ترجمہ نہیں کیا ہے مثلاً " And then she would return to her round of duties.'' اسی کے ساتھ she would say cheerfully, کا ترجمہ دونوں مترجمین نے اپنے ہدفی قارئین کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا ہے۔ عابد حسین نے cheerfully کے لیے ''خندہ پیشانی'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہی مناسب وموزوں بھی ہے کیونکہ یہاں ہدفی قارئین اس لفظ کا لطف لیں گے۔ اس کے برعکس عائشہ شمس نے ''خوش دلی'' کا لفظ برتا ہے اور یہ بھی انتہائی مناسب وموزوں ہے کیونکہ ان کے ہدفی قارئین بچے ہیں جن کے لیے لفظ ''خندہ پیشانی'' مشکل لفظ ہے۔ fugitive کا ترجمہ ''سیماب وش'' ایک بے حد خوب صورت ترجمہ ہے، ایک ادنیٰ درجہ کا مترجم بڑی ہی آسانی سے ''مفرور'' کا لفظ استعمال کر کے ترجمے کی خوب صورتی کو غارت کر سکتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ سید عابد حسین کو جو گرفت زبان وادب پر تھی اس کی بناء پر ان سے اسی طرح کے خوب صورت اور بامعنی ترجمے کی توقع کی جاتی ہے۔ عائشہ شمس نے لفظ fugitive کا ترجمہ نہ کر کے صرف سورج لکھ دیا ہے اور بچوں کے نقطۂ نظر سے یہی مناسب بھی ہے۔ بہر حال زیر بحث دونوں ہی ترجمے اپنے ہدفی قارئین کے لحاظ سے انتہائی مناسب ہیں اور پڑھے جانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆☆☆

سید انعام الرحمٰن

ریسرچ اسکالر

شعبہ تراجم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500

موبائل: 9381000765

ایک بچے کا خوف جہنم

حضرت بہلولؒ گزر رہے تھے، ایک بچے کو دیکھا ... وہ کھڑا رو رہا تھا ... دوسرے بچے اخروٹ سے کھیل رہے تھے... انہوں نے سمجھا اس کے پاس اخروٹ نہیں، اس لیے رو رہا ہے، میں اس کو لے کر دیتا ہوں، انہوں نے کہا بیٹا! رو نہیں... میں تجھے اخروٹ لے کر دے دیتا ہوں... تو بھی کھیل۔

اس بچے نے کہا: بہلول! کیا ہم دنیا میں کھیلنے آئے ہیں؟

ان کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ بچہ ایسا جواب دے گا تو انہوں نے کہا اچھا، پھر کیا کرنے آئے ہیں؟

بچے نے کہا: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے آئے ہیں...

انہوں نے کہا بچے!... ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو... تمہارے غم کی یہ چیز نہیں ہے، ابھی تو تمہارا اس منزل میں آنے میں بھی بہت وقت پڑا ہے...

تو اس نے کہا: ارے بہلول! مجھے دھوکہ نہ دے... میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے ... وہ صبح جب آگ جلاتی ہے تو پہلے چھوٹی لکڑیوں سے جلاتی ہے اور پھر بعد میں بڑی لکڑیاں رکھتی ہے... اس لیے مجھے ڈر ہے کہیں دوزخ مجھ سے نہ جلائی جائے اور میرے اوپر بڑوں کو نہ ڈالا جائے۔

یہ سن کر بہلول تو بے ہوش ہو کر گر گئے۔

مضامین

ادب وصحافت کا مشعل بردار: قمر اقبال

ادب اور صحافت کا ابتداء سے ہی چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اردو ادب ایسے سیکڑوں تخلیق کاروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو بہ یک وقت شاعر ہونے کے اپنے وقت کے معتبر صحافی بھی مانے گئے۔ ایسی ہی گونا گوں صلاحیتوں سے مزین ہستیوں میں ''قمر اقبال'' کا شمار ہوتا ہے۔

قمر اقبال کا پورا نام اقبال محمد خان تھا اور یہ 2/ فروری 1944ء کو داد محمد خان کے گھر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔

قمر کی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں نہیں ہو پائی کیوں کہ تلاش معاش کے سلسلہ میں ان کے خاندان کو کھنڈوہ' مدھیہ پردیش ہجرت کرنی پڑی۔ یہیں انہوں نے ''آر سی مشن اسکول'' سے دسویں کا امتحان کامیاب کیا۔

زمانہ طالب علمی سے ہی قمر کو شعر و شاعری کا چسکہ لگا۔ قمر نے عملی زندگی کا آغاز محکمہ زراعت میں بہ حیثیت کلرک کیا۔ لیکن شاعرانہ مزاج اور طبیعت کی بے اعتدالی نے انہیں زیادہ دنوں تک سرکاری نوکری سے وابستہ ہونے نہیں دیا۔ ایک دن اسی کشمکش میں طویل رخصتی کی درخواست دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نوکری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

کم و بیش ایک سال کسم پرسی میں گزارنے کے بعد روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز سے بہ طور معاون مدیر وابستہ ہوئے جس کا سلسلہ عمر کے آخری ایام تک جاری رہا۔ قمر نے 44 سال 5 مہینے اور 16 دن کی عمر طبعی پائی اور 18 جولائی 1988ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

ادب کی اساس حسن' خیر اور صداقت پر مشتمل ہے۔ قمر کی شاعری میں ہمیں ان تینوں عناصر کی کارفرمائی بہ درجہ اتم دکھائی دیتی ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی شاعری کو صرف گل و بلبل' مئے و مینا تک محدود نہیں رکھا بلکہ ادب میں رونما ہونے والی جدید تبدیلیوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ جس کی بہ دولت ان کی شاعری شخصی نہ ہو کر زمانہ کے کرب والم کا ترجمان بن گئی۔ انہوں نے اپنی شاعری کو صرف جدید رجحانات تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اردو کی قدیم توانا شعری روایات سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ جس کے بناء قمر کی شاعری قدیم اور جدید کا ایسا مرقع بن گئی کہ جس میں بہ یک وقت قدیم اور جدید اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ بہ طور مثال یہ شعر ملاحظہ ہو جس کے مصرع اولی میں قدیم رنگ دکھائی دیتا ہے جب کہ مصرعہ ثانی جدید شعری آہنگ سے لیس نظر آتا ہے:

یاد آتی ہے تو اک شمع جلا جاتی ہے
درد اٹھتا ہے تو تحفہ میں غزل دیتا ہے

اسی نوع کی تثلیث بھی دیکھیے:

سب میں ٹھنڈک کہاں شجر کی طرح
داغ اپنا ہے چاندنی سب کی
کون جیتا ہے یوں قمر کی طرح

قمر کے یہاں مستحکم شعری روایات کے ساتھ فنی رچاؤ، نرم ونازک لہجہ، نغمگی، گھلاوٹ، برجستگی، تشبیہ استعارے، علامت اور پیکر کا استعمال موقع ومحل کی مناسبت سے مؤثر انداز میں ہوا ہے۔

شعر ملاحظہ ہو:

اڑتے جگنو حسیں آنکھوں میں اتر پڑتے ہیں
وہ جو ہنستا ہے تو گالوں میں بھنور پڑتے ہیں

شاعر نے مذکورہ شعر میں اپنے محبوب کی آنکھوں کی چمک کو اڑتے جگنو سے تشبیہ دی ہے تو ہنسی کے دوران محبوب کے گالوں پر ہنسنے والے دائرہ کو بھنور سے تشبیہ دے کر نئی معنویت عطا کی ہے جس سے شعر میں نغمگی کی کیفیت پیدا ہونے کے ساتھ محبوب کا حسن الفاظ کے سانچہ میں ڈھل کر مجسم دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور شعری اظہار میں قمر نے قلم کو سانپ سے تشبیہ دے کر گویا سچے قلم برداروں کے کرب کو واضح کیا ہے۔

کہتے ہیں:

قلم کے سانپ سے ڈسوالیا قمر خود کو
کہ جیسے کوئی خزانہ میری تلاش میں ہے

تشبیہ کی ایک اور بہترین خلاقی ان کی تثلیث میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جس میں جسم کو مقبرے سے تشبیہ دے کر ایک نئے جہاں معنی کو آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بہت کامیاب رہی ہے:

ہے نہ جانے کہاں دیار ترا
جسم کے مقبرے میں روح مری
کب سے کرتی ہے انتظار ترا

قمر کے کلام میں ہمیں بہترین استعاراتی نظام بھی نظر آتا ہے جو چونکانے کے ساتھ ایک اچھوتے خیال کو نہایت برجستگی کے ساتھ پیش کرتا ہے جس سے قاری پر حیرت واستعجاب طاری ہو جاتا ہے۔

فرماتے:

کیا ہے درد لفظوں کے حوالے
یہ نیلم کس نے پگھلایا غزل میں

شاعر نے درد کو لفظوں کے حوالہ کرنے کے عمل کے لیے نیلم کو بہ طور استعارہ استعمال کیا ہے۔

اُردو شاعری میں شاذ ونادر ہی ایسی مثال دیکھنے کو ملے۔ قمر اقبال نے دراصل اس وجہ سے ان کو پالیا تھا جہاں شاعر کی زبان سے ادا ہوا ہر حرف اپنا ایک سیاق وسباق رکھنے کے باوجود آفاقیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ذیل کی تثلیث ہے جس میں انہوں نے زمانے کے خداؤں کو عبرت حاصل کرنے کا درس دیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ جب ایسے لوگ وقت اور حالات کے شکنجوں میں کسے جاتے ہیں تو ادائی کی رعونت، جاہ وجلال آن واحد میں فنا ہو جاتے ہیں۔

کوئی آیا نہ خون دینے کو
تھا نہ وارث کوئی بھی سورج کا
شام آئی ہے لاش لینے کو

قمر کی شاعری میں تشبیہ' استعارہ جہاں خوب صورت معنویت لے ہوئے ہے وہیں انہوں نے علامت نگاری سے بھی خوب خوب کام لیا ہے۔ روایتی علامتوں کے علاوہ آفاقی علامتوں نے قمر کی تخلیق فضاء کو ہموار کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے ان علامتوں میں سانپ' خنجر' ابر وغیرہ کو برتتے ہوئے اپنی بات سیدھے قاری تک پہونچانے کی کوشش کی ہے۔

شعر دیکھیے گا:۔

پھر نہ پتوں میں کوئی سانپ چھپا بیٹھا ہو
پھر سر شاخ پرندہ کوئی چلایا ہے

محولہ بالا شعر میں آج کے مفاد پرست دور کی بہترین عکاسی کی گئی ہے جو ساتھ رہ کر دھوکہ دینے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

مروجہ علامتوں میں شجر کو بہ طور علامت جدید شعراء نے بھی عصر کی سچائیوں کو بیان کرنے کے لیے اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے' قمر کے پاس شجر دراصل اس بے یار و مددگار کیفیت کی نمائندگی کرتا ہے جس میں انسان چاہ کر بھی حالات کے شکنجہ سے نکل نہیں پاتا جہاں پورا ماحول پراگندگی کا شکار ہوا ہو۔

ایسے حالات کی ترجمانی تثلیث میں پیش ہے:۔

وقت شعلے اگل رہا ہے یہاں
اک شجر کو بچائے کیا کوئی
دہشت کا دشت جل رہا ہے یہاں

ان اوصاف شعری کے باوصف قمر کے کلام میں محاکات' پیکر تراشی' صنعت تضاد' تلمیح' مراعاۃ النظیر' فوق النقاط' تکرار لفظی اور صنعت ارشاد وغیرہ کا کوئی استعمال ہوا ہے۔

ان کی شاعری زمانے کے کرب و آہوں کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جو ہر کسی کے دل و دماغ کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے مجبور کرتا ہے قمر کی اسی حسیت کے حوالے سے قاضی سلیم کہتے ہیں:

''قمر اقبال وقت کی زیرہ ریزہ پھسلتی ریت کو ایک لمحہ کے لیے سہی اپنی مٹھی میں تھام کر دکھا سکتا ہے، لوگو! یہ تمہارے عصر کی سچائی ہے کل تم اسے پہچان بھی نہ پاؤ گے اس لیے یہ نقش جو میری فکر و نظر کے عدسوں نے ریکارڈ کیا ہے۔ اسے پڑھو یہ تم کو اپنی پہچان میں مدد و مددگار رہوں گے''۔

(تبصرہ' قاضی سلیم' تتلیاں' نفیس' پریس' اورنگ آباد' ۱۹۸۱: ص ۳)

صداقت پر مبنی افکارات نے ہر دور میں اپنے عہد کے سچے داستان گو کا کردار ادا کیا ہے جہاں بنا کسی لاگ لپیٹ کے زندگی سے لے کر موت تک مسائل کچھ اس ڈھنگ سے بیان کرنا کہ وہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بننے کے ساتھ ایک بہترین شاہ کار زمانہ بھی ثابت ہوئیہ ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ ایسی ترجمانی صرف وہ فن کار ہی کر سکتا ہے جس نے زندگی کو ایک ناقد اور شاعر کی حیثیت سے جیا ہے۔ اگر ہم قمر اقبال کے فکری اساس کو دیکھیں تو ان کے آگے دنیا کی حیثیت و ہستی صرف بازیچہ اطفال بن کر رہ گئی تھی۔ وہ زمانہ کے سرد و گرم حالات پر نہ صرف نکتہ چینی کرتے رہے بلکہ انھوں نے اپنے طنز آمیز نشتر کے ذریعہ اس کا تریاق بھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔

قمر نے جہاں غزل میں اپنے فکری احساس کو بہ درجہ اتم پیش کیا وہی تثلیثات میں محض تین مصرعوں کے ذریعہ کسی اہم مسئلہ یا نکتہ کو اتنی کامیابی سے بیان کیا کہ قمر اقبال اور تثلیث ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم نظر آتے ہیں۔ اتنی برجستی اور وہ بھی غنائیت سے ہر پیغام کسی شاعر کے قلم سے قرطاس پر جلوہ افروز ہو تو وہ اپنا سحر تا دیر چھوڑ جاتا ہے‘ ایسی ہی سحر انگیز تثلیث سے آپ بھی محظوظ ہوئیے:

کون ہر سو یہ بات پھیلائے
موسمِ گل کی راہ تکتا ہے
ہر شجر اپنا ہاتھ پھیلائے

دیکھا آپ نے کس سادگی سے شاعر نے ایک ایسے منظر کو ہمارے سامنے پیش کر دیا کہ وہ صرف شجر کی بات نہ ہو کر زمانہ کے کرب کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ تثلیث کے باب میں قمر کی انہی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے بشر نواز نے کیا خوب کہا ہے:

’’قمر اقبال کا ذہن تعمیمی نہیں تخصیصی ہے وہ خارجی واقعہ کو واردات بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی تثلیثات بہ ظاہر صرف شاعر کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنا عکس دیکھ سکتا ہے‘‘۔

(رنگ اور پہچان‘ بشر نواز‘ تتلیاں‘ نفیس پریس‘ اورنگ آباد ۱۹۸۱ء ص ۶۵)

ان شعری خصوصیات کے علی الرغم قمر کا شعری مسلک ابتداء سے ہی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی رہا ہے۔ غزل وتثلیث کے علاوہ نظموں میں بھی انہوں نے اپنے بنیادی نظریات کو مسخ ہونے نہیں دیا۔ محراب‘ کتابوں میں جو لکھا ہے‘ ان کہی اور روبرو ایسی نظمیں ہیں جن میں ان کے نظریات بڑے شدومد کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سچے محبِ وطن‘ امن وآشتی کے پیامبر‘ دوستوں کے دوست تو دشمنوں کو بھی قمر نے گلے لگانے سے گریز نہیں کیا۔ ان کے کلام وافکار کی اساس صرف اور صرف ’’محبت‘‘ کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیوں کہ جہاں کہیں فسادات برپا ہوتے قمر کا دل خون کے آنسو روتا اور وہ سراپا محبت بن کر عوام کو انسانیت کا آفاقی درس دینے کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ ’’فساد زدہ شہر‘‘ ایک ایسا منظر نامہ ہے جو اپنے اندر انسان نما درندوں کو جھجوڑنے کا ہنر رکھتا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

نلوں میں صبح کو پانی نہیں آتا
تو یوں باشندگانِ شہر ہیں سارے پریشاں سے
کہ جیسے
آدمی اب آدم کا خوں نہیں پیتا

کہا جاتا ہے کہ انسان کو جب اس کی ذات کا درک ہو جاتا ہے تو وہ ہر آن کرب وآگہی سے دو چار ہوتا رہتا ہے۔ جب یہی کیفیت کسی تخلیق کار کو نصیب ہوتی ہے تو اس کا اظہار اپنی منتہی کو پہونچ جاتا ہے۔ شاعر چوں کہ اپنے عہد کا ایسا ترجمان ہوتا ہے جو اپنی حساس طبیعت کے باعث زمانہ کی آہٹوں‘ کروٹوں کے علاوہ معاشرتی انتشار‘ تضادات‘

مضامین

عدم رواداری جیسے مزاج کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتا ہے جب یہی محسوسات شعری قالب میں بیان ہوتے ہیں تو آفاقیت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔فرصت' کھنڈر' بمبئی' عصر حاضر اور افادیت جیسی نظموں میں آگہی کے کرب کو قمر اقبال نے کچھ اس طرح سمودیا کہ ایک سچے فن کار کی تمام محرومیاں اس میں درآ گئی ہیں۔نظم ''وصیت'' کو پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ سچا اور اچھا فن کار معاشرہ سے کیا چاہتا ہے اور وہ اسے کیا دینا چاہتا ہے۔نظم دیکھیے:

کبھی جو فن کی ہمارے کہیں نمائش ہو
ادب کے چاہنے والوں میں گر کسی کو یہاں
ہمارے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش ہو
تو ایک بات ہماری طرف سے کہہ دینا
''دیارِ فن کی لہو تھوکتی فضاؤں میں
کراہتی ہوئی فالج زدہ ہواؤں میں
کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق''

قمر کے ہم عصروں میں غیاث متین' رؤف خلش' حسن فرخ' شاہد کبیر' مدحت الاختر اور عبدالرحیم نشتر کا شمار ہوتا ہے لیکن ان تمام سے ہٹ کر انہوں نے اپنے لیے ایسی رہ گزر کا انتخاب کیا جو انہیں شاعری کے زمرے سے نکال کر ایک فلسفی' مفکر اور دانشور کی صفات عطا کرتی ہے۔ بے شک قمر اقبال نے مذکورہ صفات ودرجات کو حاصل کرلیا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ نہایت قلیل مدت میں ان کا کلام اپنی سرحدات سے ماورا ہوکر انسانیت کا ہمنوا ومشعل بردار بن گیا

جب ان ستودہ صفات کا حامل شاعر' پیشہ' صحافت کو اختیار کرتا ہے تو ظاہری بات ہے کہ یہاں بھی وہ حساسیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا جب کہ قمر کی زندگی ادب اور صحافت ان دونوں خانوں میں کچھ اس طرح بٹ گئی تھی کہ دونوں کو جدا کر کے دیکھنا محال معلوم ہوتا ہے۔عمر کے ابتدائی دنوں میں جس صحافت کو انہوں نے شوقیہ طور پر اختیار کیا تھا وہی سرکاری نوکری سے کنارہ کشی کے بعد ان کا ذریعہ معاش بن گئی۔

روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز سے وابستگی نے انہیں عوام سے اتنا قریب کردیا تھا کہ عوامی مسائل' حکومتی اقدامات اور صحافتی ردعمل ان تینوں محوروں کی کارکردگی سے عام قاری کو واقف کروانا اپنا فرض عین سمجھ لیا تھا۔

اورنگ آباد ٹائمز میں اداریہ نویسی کے علاوہ بات سے بات' بال کی کھال' اور ہزل گوئی کے مخصوص کالم ان کے ذمہ تھے۔انگریزی اور مراٹھی خبروں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ دلائل وبراہین کی روشنی میں بصیرت افروز اداریہ لکھتے۔ قمر اقبال کی نظر اور فکر اتنی تیز اور جامع تھی کہ اداریہ کا موضوع شروع سے لے کر آخر تک ان کی گرفت میں ہوتا۔جس کی وجہ سے قومی سطح پر شائع ہونے والے اردو کے معیاری اخبارات ان کے لکھے اداریوں کو اخذ کیا کرتے تھے۔

صحافتی زندگی میں بھی انہوں نے شعر وسخن کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ادبی نگارشات کے لیے جہاں ''رفتارِ ادب'' کی ابتداء کی وہیں خواتین کے لیے

''جھومر'' اور بچوں میں مطالعہ کے فروغ اور ادبی جلا بخشنے کے لیے ''تتلیاں'' جیسے ضمیمہ جات کا آغاز کیا۔ ان اقدامات سے ان کے صحافتی اقدار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے معاشرہ کے ہر فرد کی پسند اور دلچسپی کا ہر طرح سے سامان فراہم کیا۔

قمر کی صحافتی زندگی کا اہم پہلو ہزل گوئی کی شروعات ہے ۔ زندگی سے وابستہ مسائل وافکار کو مختلف موضوعات فرقہ پرستی' سرمایہ داری' جمہوریت' فیشن' تعلیم' شاہی دسترخوان' نان قلیہ' کالے دھندے وغیرہ کو ہزلوں کا عنوان بنایا۔

ہزل ''شاہی دسترخوان'' کا یہ شعر پیش ہے جس میں وہ اپنی پسماندگی کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے لبوں پر ہنسی کھل اٹھتی ہے۔

کباب ومرغ وماہی کے مزے دشمن اڑاتے ہیں
مجھے یارب غریق دال رکھا جائے گا کب تک

اسی طرح الیکشن کے دوران پیش آنے والے واقعات کی عکاسی بھی ملاحظہ ہو:

الیکشن کا زمانہ آگیا ہے
مزے سے مفت کھانا آگیا ہے

قمر کا طنز موقع محل کی مناسب سے اتنا چست ہونا کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' ایک طرح سے ان کا طنز تیر بہ ہدف کا کام انجام دیتا ہے۔

ان کی مشہور ہزلوں میں مقبرہ میں ملاقات' شعلے' آخری بس' ہمیشہ کا عذاب' بھنڈی کا سالن وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

اگر قمر اقبال کی ہزلوں کو یکجا کیا جائے تو ایک معیاری طنز ومزاح پر مشتمل مجموعہ منظر عام پر آ سکتا ہے۔ اس جانب شائقین علم وادب کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قمر کی دوسری انگ بہ طور صحافی بڑی دل آویز اور شہرت سے پر رہی۔ لوگ انہیں اس قدر ٹوٹ کر چاہنے لگے تھے کہ ان کی ہر خوشی وغم میں قمر کی شرکت لازم سمجھی جاتی تھی اس طرح ان کے تئیں قمر کا رویہ بھی ویسا ہی رہا جس کا بین ثبوت ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''موم کا شہر'' کی رسم اجراء اور ''جشن قمر اقبال'' ہے۔ نہرو بھون اورنگ آباد میں منعقدہ ہوئی مذکورہ تقریب میں مداحوں کا اژدہام دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مداحوں کے خلوص اور محبت کو دیکھ کر معروف ڈراما نویس و فلم رائٹر ساگر سرحدی نے کہا تھا:

''کسی بھی غیر فلمی شخصیت کی اس قدر مقبولیت پر میں حیران ہوں''۔

اسی صحافتی زندگی میں قمر اقبال نے شہرۂ آفاق غزل کہی جسے مشہور غزل گلوکار پنکج ادھاس نے آواز دی جس کا مطلع اتنا متاثر کن اور جذبۂ سرشاری سے مملو ہے کہ قاری پر سحر طاری ہو جاتا ہے۔ مطلع پیش ہے۔

خود کی خاطر نہ زمانے کے لیے زندہ ہوں
قرض مٹی کا چکانے کے لیے زندہ ہوں

قمر کی مذکورہ غزل کو پنکج کے البم ''مکرر'' میں سماعت کیا جا سکتا ہے ۔ ایک اور واقعہ سے بھی ان کے کلام کی

مضامین

مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔جس وقت پاکستان میں جنرل پرویز مشرف فوجی حکمرانی چلا رہے تھے اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں انہوں نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے قمر کا متذکرہ شعر پڑھا تھا۔

اسی محبوبیت اور کلام کی تاثیر کا نتیجہ رہا کہ ان کے کلام کے مراٹھی و پنجابی زبان میں تراجم ہوئے۔

انہی گوناگوں صلاحیتوں کے باوصف انہیں مہاراشٹرا اردو اکاڈمی نے ۱۹۸۴ء میں ''بہترین صحافی'' کے ایوارڈ سے نوازا تھا۔علاوہ ازیں مذکورہ اکاڈمی کی جانب سے ان کے شعری مجموعوں ''تتلیاں'' اور ''موم کا شہر'' کو ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۶ء کو بہترین شاعروں کے زمرے میں بالترتیب انعامات عطا کیے گئے

قمر اقبال کی علمی، ادبی وصحافتی خدمات میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۸۱ء صنف تثلیث پر مبنی مجموعہ ''تتلیاں'' منصۂ شہود پر آیا۔ برصغیر ہندو پاک میں صنف تثلیث پر یہ قدامت کے اعتبار سے پہلا مجموعہ ہے، جو زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

انہوں نے یوں تو غزل، تثلیث اور نظم جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن، میں انہیں بنیادی طور پر غزل گو شاعر کہوں گا۔ان کی غزل کئی اعتبار سے آفاقیت کا درجہ رکھتی ہے۔ زمانے کے نشیب وفراز سے لے کر انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا اس میں جس قدر احاطہ ہوا ہے دیگر میں کم کم ہی ہوا۔ دوسرے غزل میں فکر کی گہرائی اور فنی سلیقہ نے انہیں دیگر فن کاروں کی بہ نسبت غزل کا نامور و معتبر شاعر بنا دیا۔

ان کی غزلیں اتنی پر معنی اور تہہ دار ہیں کہ انہیں جتنی بار پڑھا جائے گا نئے معنی ہمارے سامنے واشگاف ہوتے رہیں گے۔

خیال کی ندرت، معنی آفرینی، الفاظ کی دروبست، لہجہ کی حلاوت نے ایسا سحر برپا کردیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تازگی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

قمر اقبال کی شعری اور صحافتی خدمات کو پیش نظر رکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا شمار بیسویں صدی کے ان منتخب شعراء میں ہوگا جنہوں نے اپنے فکر وفن کی جولانیوں سے جہاں شعروادب کو گرویدہ کیا تو صحافتی اقدار کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے اس کے اصولوں پر کوئی آنچ آنے نہیں دی۔ یہی وہ صفات ہیں جس سے ایک زمانہ ان سے متاثر رہا نوجوان نسل کی ادب پروری کی تو وہیں شعراء کی طویل فہرست میں اپنی انفرادیت اور جودت طبع کی وجہ سے اپنے ہونے کا احساس دلایا اور زمانے کی سرپھری فضاؤں میں اپنی فکر کے ایسے ایسے گل بوٹے کھلائے کہ زمانہ تادیر انہیں یاد رکھے گا۔ غرض......! قمر اقبال نے دکن کی تابندہ شعری روایات کو قائم رکھا بلکہ اس کے فروغ کے لیے کوشاں بھی رہے، ان کی انہی کاوشوں پر ''ارضِ دکن'' تا ابد نازاں رہے گی۔۔۔!!

☆☆☆

ڈاکٹر جہانگیر احساس
8790687051

مضامین

نسیمہ تراب الحسن کی خاکہ نگاری

نسیمہ تراب الحسن کا شمار حیدرآباد کی نمایاں ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ان کا شمار غیرافسانوی نثر لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے خاکوں کے علاوہ مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نثر کے علاوہ شاعری سے بھی انہیں رغبت رہی ہے۔ شاعری میں انہوں نے غزل، نظم اور نعت وغیرہ بھی تخلیق کئے ہیں۔

نسیمہ تراب الحسن ۱۹۴۰ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا بچپن میرٹھ میں گزرا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو کئی لوگ ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہو رہے تھے لیکن نسیمہ تراب الحسن کے اہل خانہ میرٹھ سے ہجرت کر کے حیدرآباد منتقل ہوئے اور پھر حیدرآباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا۔ ان کا پہلا مضمون ''میں اور میرا حیدرآباد'' ہے۔ لیکن ادبی دنیا میں ان کی شہرت ان کے خاکوں کی وجہ سے ہوئی اور اردو دنیا میں وہ بحیثیت ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔

خاکہ نگاری اردو کی بے حد مقبول صنف تصور کی جاتی ہے۔ خاکہ نگاری میں موضوع کی کوئی تخصیص نہیں ہے لیکن اکثر خاکے ایسی شخصیتوں پر لکھے گئے ہیں جنہوں نے ادب یا دوسرے فنون لطیفہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے کارناموں سے ہم متاثر اور مستفید ہوتے ہیں ان کی نجی زندگی کی تفصیلات جاننے کی خواہش ہمارے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ہر صنف ادب کی طرح اس کے بھی اپنے مسائل اور تقاضے ہوتے ہیں جن سے خاکہ نگار کوروگردانی نہیں کر سکتا۔ اردو میں خاکہ نگاری کو پروان چڑھانے میں ایسے صاحب طرز ادیبوں نے حصہ لیا ہے۔ جو افسانہ نگاری، انشائیہ یا مزاح نگاری کے فن پر قدرت رکھتے تھے۔ نتیجے کے طور پر خاکے کی صنف میں مختلف اصناف ادب کی خصوصیات جمع ہوگئیں اور اس میں اسالیب کے تنوع کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی خاصی وسعت پیدا ہوگئی۔

خاکہ کسی شخصیت کو قلمی تصویر کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں sketch کہتے ہیں۔ خاکے میں موضوع خاکہ کی سیرت و شخصیت کے مختلف گوشوں، حلیے، عادت واطوار اور کردار، خامیوں اور خوبیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے بقول ڈاکٹر صابرہ سعید:

''خاکہ نگاری صنف ادب کی حیثیت سے چند انفرادی خدوخال اور خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ خاکہ نگار شخصیت کی، سیرت کی دھوپ چھاؤں اس کے

مضامین

عادات واطوار، اس کے کردار کے سیاہ وسفید کی ایسی تصویریں پیش کرتا ہے جس سے شخصیت کے اہم گوشے بے نقاب ہوجاتے ہیں۔''

نسیمہ تراب الحسن ادبی حلقوں میں اپنی خاکہ نگاری کی وجہ سے خوب شہرت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنا پہلا خاکہ ڈاکٹر عبدالکلام کے عنوان سے لکھا۔ انہوں نے کئی شخصیات پر خاکے لکھے ہیں جن میں سے اکثر ادیب ہیں۔ادیبوں کے علاوہ انہوں نے مختلف شخصیات مثلاً سیاسی لیڈروں،صحافیوں اور مصور وغیرہ پر بھی خاکے لکھے ہیں۔ ان کے خاکوں کے اب تک تین مجموعے ''نقوش دل''،''ذکراس پری وش کا'' اور''گویا دبستان کھل گیا'' منظر عام پر آچکے ہیں۔

جن ادبی شخصیات پر ان کے خاکے ملتے ہیں اُن میں اہم نام سجاد ظہیر، علی باقر، مجتبٰی حسین اور رضیہ سجاد ظہیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔صحافیوں میں عابد علی خان، زاہد علی خان اور مصور یم۔ ایف حسین پر بھی ان کا عمدہ خاکہ ملتا ہے۔مجاہدین آزادی یا سیاسی شخصیات میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

نسیمہ تراب الحسن حیدرآباد کی لکھنے والی خواتین ادیبوں میں ایک اہم نام ہے جنہوں نے خاکہ نگاری میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے بڑی تعداد میں خاکے لکھ کر اس کے فن کو ترقی کی راہوں میں پہنچانے کی کوشش کی۔ان کے خاکوں کا وصف یہی ہے کہ وہ جن شخصیات سے متاثر ہوتی ہیں اور جن سے ان کے دیرینہ مراسم ہیں ان پر خاکے لکھ کر اپنی وابستگی کا اظہار کرتی ہیں۔ان کے خاکوں میں خاکہ نگاری کے لوازمات کو برتنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔مثلاً حلیہ نگاری، کردار نگاری ، واقعہ نگاری اور عادات واطوار اور موضوع خاکہ سے خاکہ نگار کے دیرینہ مراسم وغیرہ سبھی کچھ نظر آتے ہیں۔ ان کے خاکوں کا اسلوب سادہ مگر شگفتہ و لطیف ہے۔اسلوب کی تازگی وشگفتگی ہی ان کے خاکوں کی جان ہے۔علامہ اعجاز فرخ ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نسیمہ تراب الحسن کا اسلوب سادہ ہے لیکن اس سادگی میں غضب کی پرکاری ہے۔وہ اپنے اطراف کی معمولی واردات کو بھی احساس کی پرت پر شدت سے محسوس کرتی ہیں، اور وہ جیسے محسوس کرتی ہیں من وعن اسے منتقل بھی کردیتی ہیں۔اس اعتبار سے ترسیل وابلاغ میں کامیاب ہیں''

نسیمہ تراب الحسن نے اپنے خاکوں میں فن اور فنکاری کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو فن اور فنکار کو سمجھنے میں ممدوح ومعاون ثابت ہوسکتے ہیں۔انہوں نے ہمیشہ اپنے خاکوں میں ان لوگوں کو جگہ دی ہے جن سے محترمہ ذاتی طور پر مل چکی تھیں۔ اس بات کا انہوں نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے:

مضامین

’’کسی فرد پر مضمون یا خاکہ لکھنے کی خواہش میرے دل میں اسی وقت جاگتی ہے جب میں اس ہستی کی مجموعی شخصیت سے متاثر ہوتی ہوں۔‘‘

خاکہ نگار عموماً ان شخصیات کو اپنے خاکے کا موضوع بناتا ہے جن سے ان کے دیرینہ مراسم ہوں۔ لیکن بعض اوقات ادیبوں نے ایسی شخصیات کو موضوع بنایا ہے جن سے ان کے تعلقات نہیں تھے یا پھر جن کے بارے میں انہوں نے کسی اور سے جانا ہو۔ جن کی شہرت بہت زیادہ ہے۔ مثلاً منٹو نے ’’محمد علی جناح‘‘ سے کبھی ملاقات نہیں کی تھی لیکن ان کی شخصیت پر انہوں نے بہت عمدہ خاکہ لکھا ہے۔ اسی طرح آغا حیدر حسن بھی اپنے خاکوں کے لیے مشہور ہے۔

نسیمہ تراب الحسن نے بھی اپنے چند خاکوں کے لیے ایسی شخصیات کو موضوع بنایا ہے۔ جن سے ان کی ملاقات نہیں تھی۔ لیکن وہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھی۔ خاکوں میں شخصیت سے متاثر ہونا خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے تبھی وہ عمدہ اور اچھے خاکے تصنیف کر سکتا ہے۔ نسیمہ تراب الحسن نے جواہر لال نہرو، گاندھی جی ،مولانا ابوالکلام آزاد جیسی مجاہدین آزادی کی شخصیت سے بے حد متاثر تھی۔ انہوں نے آزادی کی جدو جہد کے سلسلے میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

نسیمہ تراب الحسن کے خاکوں میں مکالمہ نگاری کا حسن بھی نظر آتا ہے حالانکہ خاکہ نگاری میں مکالمہ نگاری کا جز ضروری نہیں ہے۔ ان کے خاکوں میں مختلف واقعات کے حوالے سے مکالمہ نگاری کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن بہت زیادہ مکالمے نہیں ملتے اور وہ بھی صرف ان موقعوں پر جب مزاحیہ گفتگو یا واقعات کا بیان ہو اس طرح کے مکالمے نظر آتے ہیں۔

کردار نگاری خاکے کا اہم جز ہوتی ہے۔ کیونکہ خاکے کا موضوع کوئی نہ کوئی شخصیت ہوتی ہے اور چونکہ یہ شخصیت علحدہ خصوصیت رکھتی ہے۔ ان خصوصیات کی نشاندہی کرنا ہی دراصل خاکے کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے کردار نگاری کو خاکے میں بنیادی حیثیت ہے۔ صابرہ سعید خاکے میں کردار نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

’’خاکے میں زندگی کا اظہار اچھی کردار نگاری پر منحصر ہیں۔ چونکہ خاکے میں کردار کو براہ راست سامنے لانا پڑتا ہے اس لیے مذکورہ شخصیت کے جذبات و احساسات کی عکاسی اور اس کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کے لیے معلومات بھی فراہم ہوں اور خود خاکہ نگار کے تاثرات بھی عیاں ہو جائیں۔‘‘

نسیمہ تراب الحسن نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے اخلاق و کردار کے ان خاص صفات کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی اکثر خاکوں میں انہوں نے

مضامین

موضوع خاکہ کی خوش اخلاقی، لہجہ کا دھیما پن، برتاو، خلوص اور شریف النفسی جیسی صفات پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔انشائیہ نگار ہو یا خاکہ نگار اس کی سب سے بڑی صفت یہ ہوتی ہے۔یعنی خاکہ نگار یا انشائیہ نگار دلکش و متاثر کن اسلوب کے ذریعہ ہی اپنی بات کو پیش کرتا ہے تاکہ قاری کی دلچسپی برقرار رہے۔نسیمہ تراب الحسن کے قلم میں بھی یہ جادو بیانی کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ مختلف انداز سے موضوع خاکہ کی شخصیات کے مختلف گوشوں کا بیان کرتی ہے۔ان کا اسلوب بڑا جاندار ہوتا ہے۔نسیمہ نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ان کی بعض نمایاں صفات کی نشاندہی کی ہے جن سے وہ بے حد متاثر تھیں۔ شخصیات سے تاثر قبول کرنا اور انہیں سلیقے سے بیان کرنا انہیں خوب آتا ہے۔انہوں نے شخصیات کی خامیوں پر بہت کم نگاہ ڈالی ہے۔لیکن جہاں بھی لکھا ہے وہاں انہوں نے غیر جانبداری سے کام لیا۔

کامیاب منظر کشی ناول اور افسانہ کو دلکش بنادیتی ہے۔جس طرح ناولوں میں اور افسانوں میں منظر کشی ضروری ہے اسی طرح منظر کشی خاکے کا ایک اہم جز ہے اس میں مصنف کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ کسی حالت یا کیفیت کا بیان اس انداز سے کرے کہ اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔منظر نگاری سے زماں اور مکاں کا تعین بھی ہوتا ہے، اوقات موسموں، کمروں اور مکانوں کے خاکے، آبادیوں کے نقشے وغیرہ کا ایسا بیان ہو کہ حقیقت کا رنگ اس میں پوری طرح جلوہ گر ہو۔نسیمہ تراب الحسن کے خاکوں میں ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ جس چیز کا منظر بیان کرتی ہیں اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین ایک بلند پایہ کے ادیب ہیں، جن کی شہرت نہ صرف حیدرآباد میں ہیں وہ بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔اردو دنیا میں وہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔مصنفہ نے اس خاکے میں جہاں ان کی شخصیت، خلوص، زندہ دلی اور مہمان نوازی جیسے صفات کا ذکر کیا ہے، وہیں ان کے فلیٹ میں دعوت میں مدعو کئے جانے والے واقعے کا بیان بھی دلنشین اور دلکش پیرائے میں کیا ہے کہ سارا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے:

''میں لفٹ سے نکلی آگے بڑھی تو ان کی بہو نے پر تپاک استقبال کیا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔کچھ خواتین قرآن پڑھنے میں مشغول تھیں۔ابھی میں تصفیہ نہ کرپائی تھی کہ تلاوت شروع کروں یا جو اس فرض سے سبکدوش ہوچکی تھی ان سے تعارف کرواؤں دلکش چہرے، نفیس، جھلملاتے کپڑے، مسکراتی آنکھیں، بچوں کی چہل پہل میں گم تھی کہ مجتبیٰ بھائی کی شریک حیات آگئیں۔ مبارک سلامت کے بعد گھر دیکھنے لگیں۔کشادہ ہال، مناسب کمرے لیکن ابھی تو یہ صرف چاردیواری سے بنی عمارت ہے۔اس کی رونق تو اس وقت دلفریب ہوگی

مضامین

جب مکین یہاں رہنے لگیں گے۔''

غرض نسیمہ تراب الحسن کے خاکوں کے تفصیلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ہیں ، ان میں زیادہ شخصیات سے ان کے قریبی تعلقات رہے ہیں جن سے وہ بے حد متاثر رہی ہیں۔ان کے خاکوں کے مطالعے سے نہ صرف شخصیات کی مختلف خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ بعض کمزوریوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔لیکن انہوں نے کمزوریوں کا ذکر بہت کم کیا ہے۔حالانکہ خاکہ نگار کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ کمزوریوں کا بیان غیر جانب داری سے کرے۔لیکن انہوں نے زیادہ تر خاکے ذاتی مراسم اور تعلقات کے بنا پر لکھے ہیں۔اس لیے ان کی کمزوریوں کو بھی مزاحیہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے خصوصاً تراب الحسن کا خاکہ اس کی اچھی مثال ہے انہوں نے اپنے خاکوں میں مختلف واقعات کے ذریعے شخصیات کی بھرپور عکاسی اور تصویر کشی ہے۔نسیمہ تراب الحسن کے اسلوب کی خاص بات یہ ہے۔کہ وہ خاکوں کی شگفتگی اور لطافت کی بدولت قاری کی توجہ کو گرفت میں رکھتی ہیں۔ان تمام خصوصیات کی بدولت ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خاکوں میں منظر نگاری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔لیکن جہاں بھی انہوں نے منظر نگاری کی مثال پیش کی ہے اس کی تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔انہوں نے اتنی میں خاکے لکھ کر اردو ادب میں اس صنف کی آبیاری میں اہم رول ادا کیا۔

مضامین

الغرض ان تمام خصوصیات کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ نسیمہ تراب الحسن حیدرآباد کی خواتین خاکہ نگاروں میں وہ واحد مصنفہ ہیں۔جنہوں نے عمدہ خاکے لکھ کر اردو ادب میں صنف خاکہ میں اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆

رمیص سلطان پوری
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو،
دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ایلی سن سے کسی نے پوچھا:
"آپ اتنے خوش کیسے رہتے ہیں"
ایلی سن نے کہا:
"میں بیوقوف لوگوں سے بحث نہیں کرتا۔"
پوچھا:
"پھر کیا کہتے ہیں ؟"
ایلی سن بولا:
میں انھیں جواب دیتا ہوں کہ " آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"
پوچھنے والے نے کہا:
"پھر بھی اپنی بات یا اپنا مؤقف منوانے کے لیے، اسے قائل کرنے کے لیے آپ کو اسے کوئی دلیل کوئی جواز تو دینا چاہیے"
اس پر ایلی سن نے پوچھنے والے کو تاریخی جواب دیا:
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں"

معراج العاشقین کے محققین وناقدین کا تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہنوز ''معراج العاشقین'' اُردو کی قدیم ترین نثری تصنیف مانی جاتی ہے ۔ اس کتاب کے مصنف دکن کے مشہور ومعروف اور بلند پایہ صوفی بزرگ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز ہیں ۔ خواجہ بندہ نواز گیسودرازؔ کو عربی، فارسی اور دکنی زبان پر کافی حد تک دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے کئی رسائل اور کئی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ ان جملہ رسائل وکتب کی تعداد مختلف محققین نے مختلف بتائی ہے۔لیکن ان تمام تصانیف کا موضوع تصوف، مذہب اور احکام شریعت سے ہے۔لیکن ان کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت ومقبولت ''معراج العاشقین'' کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ ایک رسالہ ہے اور تصوف اس کا بنیادی محور ومرکز ہے۔ یہ کتاب دلی یونی ورسٹی اور پنجاب یونی ورسٹی کے نصاب میں بہت عرصے سے شامل ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ اس رسالے میں قرآن واحادیث کے ذریعے مسلک تصوف کو بہتر طور پر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تصوف کے ایک مخصوص نظریہ پانچ تن یعنی واجب الوجود، ممکن الوجود، عارف الوجود، ذکر جلی اور ذکر حق کے ذریعے ایک انسان کس طرح واحد الوجود تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

''معراج العاشقین'' اردو کی پہلی نثری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے مع مقدمہ 1343 ھ مطابق 1927ء میں دو قلمی نسخوں کی مدد سے شائع کیا ہے ۔ ایک نسخہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا اور دوسرا نسخہ انہیں ڈاکٹر محمد قاسم ناظم کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ اس بات کا اعتراف خود مولوی عبدالحق نے مقدمہ میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہیں مولوی غلام محمد صاحب انصاری وفا مدیر'' تاج'' کی وساطت سے ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کا نسخہ دستیاب ہوا تھا۔ ان دونسخوں میں ایک نسخے کا نام معراج العاشقین تھا۔لیکن مولوی عبدالحق نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے کہ کس نسخے کا نام معراج العاشقین تھا۔ چوں کہ عبارت کی یکسانیت کی بنا پر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک ہی کتاب کی دو نقلیں ہیں۔ البتہ ان دونسخوں میں سے کسی ایک کا نام معراج العاشقین ضرور تھا۔لیکن یہ رسالہ جس طویل رسالے کا خلاصہ ہے'اس کے کئی اور نام بھی ہیں' بغیر کسی وضاحت کے مولوی عبدالحق ڈاکٹر محمد قاسم کے نسخے کی آخری تحریر کی بنیاد پر جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ نسخہ اس نسخے کی نقل ہے جو 906ء میں لکھا گیا تھا' لکھتے ہیں:

''اس سے مجھے بہت کچھ اطمینان ہوا اور ایک حد تک اس بات کا یقین ہوگیا کہ یہ حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ عشق نامہ سے بھی اس کی تائید

مضامین

ہوئی ہے۔ یہ تصوف کی ایک ضخیم کتاب ہے جو خواجہ صاحب کے مرید محمد عبداللہ بن محمد عبدالرحمٰن چشتی نے احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں تصنیف کی ہے۔اس میں حضرت کی تصانیف معراج العاشقین اور ہدایت نامہ کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی نہ کیا جائے تو کم ازکم اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا کہ یہ 906ھ سے قبل کی تصنیف ہے۔اس سے یہی امر قرین قیاس بلکہ غالب معلوم ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ حضرت ہی کی تصنیف ہے۔'' (مولانا مولوی عبدالحق ،معراج العاشقین ،ص ۷)

مولوی عبدالحق کے مذکورہ بیان کے متعلق مرزا قتیل لکھتے ہیں کہ اگر ڈاکٹر محمد قاسم کا نسخہ اس نسخے کی نقل ہے جو 906ھ کا مکتوب ہے تو مولوی عبدالحق کو نہ جانے کیوں محض اس بنیاد پر یہ یقین ہوگیا کہ یہ حضرت گیسودراز کی تصنیف ہے۔ چناں چہ ان کے مطابق زبان کی قدامت اس رسالے کو بندہ نواز سے منسوب کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوسکتی۔البتہ ممکن ہے کہ'' عشق نامہ'' مصنف محمد عبداللہ بن محمد عبدالرحمٰن چشتی میں خواجہ گیسودراز کی تصانیف کے سلسلے میں معراج العاشقین اور عشق نامہ کا جو تذکرہ کیا گیا ہے ،اس سے مولوی عبدالحق کا یہ قیاس کسی حد تک درست ہو کہ معراج العاشقین کے نام سے انہیں جو دکنی رسالہ دستیاب ہوا ہے' وہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا وہی رسالہ ہے جس کا ذکر عشق نامہ میں موجود ہے۔ الغرض مولوی عبدالحق نے صرف عشق نامہ میں خواجہ گیسودراز کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کے ذکر کی بنیاد پر دکنی رسالہ معراج العاشقین کو گیسودراز کی تصنیف تسلیم کیا ہے۔

عبدالحق کے علاوہ گوپی چند نارنگ نے ''معراج العاشقین'' کو پہلی بار 1957ء میں مرتب کرکے آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔شروعات میں گوپی چند نارنگ نے دوصفحات پر مشتمل مختصر دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے کتاب کے متعلق اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں اپنے حسن ذوق اور سلیقہ مندی کا عمدہ مظاہرہ کرکے بڑی صحت اور اہتمام کے ساتھ اسے 1957ء میں شائع کیا ہے۔اردو تحقیق کے میدان میں یہ خلیق انجم کی ابتدائی کاوش تھی۔اس وقت تک خلیق انجم متنی تنقید کے اصول وضوابط کے شرائط کے واقف کار نہیں تھے۔اس کتاب کی تالیف کا کام خلیق انجم نے اپنے عزیز اور رفیق دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی کے صلاح ومشورے سے شروع کیا تھا۔کتاب کی ابتداء میں چار صفحات پر مشتمل تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد دوصفحات کا دیباچہ خلیق انجم نے تحریر کیا ہے اور پھر تقریباً بیالیس صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا گیا ہے۔تعارف میں نثار احمد فاروقی نے ''معراج العاشقین'' اس کے مصنف خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور اس کے موئف خلیق انجم کے متعلق اہم باتیں بیان کی ہیں۔انہوں نے لکھا ہے کہ معراج العاشقین کی

مضامین

تالیف خلیق انجم کا تقریباً ایک سال کا ثمرہ ہے۔ساتھ ہی ساتھ انہوں نے خلیق انجم کی تالیف کی اہمیت و افادیت کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:۔

''انہوں نے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں ہندوستان کے صوفیائے کرام کی اخلاقی و روحانی تحریک کے بنیادی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کا مختصر مگر منصفانہ جائزہ بھی لیا ہے اور اس پس منظر میں حضرت بندہ نواز اور ان کی ادبی اور متصوفانہ حیثیت کو بیان کر دیا ہے۔'' (خلیق انجم،معراج العاشقین مع دکنی کلام،ص۱۰)

تعارف کے بعد دیباچہ میں خلیق انجم نے گیسودرازؒ کے روزانہ معمولات ،معراج العاشقین کے موضوع اور اس کی لسانی حیثیت پر مختصر گفتگو کر کے اس کتاب کے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔دیباچہ کے بعد خلیق انجم نے 42 صفحات پر پھیلا ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا ہے۔مقدمہ میں خلیق انجم نے حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کی پیدائش،خاندانی پس منظر،سفر دلی،دلی میں نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی پیروی اور مریدی اختیار کرنا،پیر و مرشد چراغ دہلوی کی وفات کے بعد واپس اپنے وطن گلبرگہ (دکن) تشریف لانا اور اس کے بعد اپنی زندگی کے آخری پچیس سال یہیں گزارنے کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔اس کے علاوہ خلیق انجم نے مقدمہ میں حضرت گیسودرازؒ کی شخصیت، خودداری، طریقہ بیعت، تعلیمات،شادی،اولاد،معراج العاشقین کا زمانہ تصنیف، گیسودرازؒ کا اپنے مریدوں کے ہمراہ زندگی گذر بسر کرنا غرض کہ معراج العاشقین اور خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کی زندگی اور زمانے کے ہر پہلو پر مدلل بحث کی ہے۔مقدمہ کے ابتدائی صفحات میں ہندوستان میں تصوف کی پوری تحریک کا مختصر مگر جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

گیسودرازؒ کی ولادت کے بارے میں ''سیر محمدی'' کے مصنف مولانا محمد شاہ محمد علی سامانیؒ نے تاریخ ولادت 721ھ بتائی ہے۔جبکہ مصنف ''تاریخ حبیبی'' نے 723ھ لکھی ہے۔خلیق انجم نے 721ھ کو صحیح تسلیم کیا ہے۔لیکن اس سلسلے میں انہوں نے کوئی شواہد پیش نہیں کیے ہیں۔

گیسودرازؒ کے اسم گرامی کے متعلق خلیق انجم نے تحریر کیا ہے کہ گیسودرازؒ کا اسم گرامی سید محمد تھا۔ابوالفتح کنیت اور القاب صدرالدین ولی الاکبرالصادق۔لیکن وہ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔

خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے بچپن پر گفتگو کرتے ہوئے خلیق انجم نے لکھا ہے کہ گیسودرازؒ بچپن سے ہی عبادت اور تبلیغ کا بہت شوق رکھتے تھے۔آٹھ سال کی عمر میں نماز کے پابند تھے اور بارہ سال کی عمر میں شب بیداری کے پابند ہوئے۔بچپن میں اپنے والد ماجد اور والدہ محترمہ کے ہمراہ آپ دکن تبلیغ کے لیے گئے تھے۔یہاں ان کے نانا اور ماموں سید ابراہیم شوقی دولت آباد کے صوبے دار تھے۔یہ وہ دور تھا جب محمد تغلق دولت آباد کو دارالخلافہ بنانا

مضامین

چاہتے تھے۔دس سال کی عمر میں گیسودراز شفقتِ پدری سے محروم ہوگئے اور پھر چار سال تک وہ اپنے نانا کے پاس رہے۔اس کے بعد گیسودرازؔ اپنی والدہ ماجدہ بی بی رانی کے ہمراہ دہلی روانہ ہوئے اور زندگی کا بڑا حصہ یہیں گذارا۔دہلی میں آپ نے حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ سے فیض حاصل کیا اور ان کی خلافت قبول کرلی۔چراغ دہلویؒ کی وفات کے بعد گیسودرازؔ واپس اپنے مادرِ وطن گلبرگہ (دکن) آگئے اور باقی پوری زندگی یہیں اپنے افرادخانہ اورمریدوں کے ساتھ گزاردی۔

گیسودرازؔ کی شادی کے متعلق خلیق انجم نے تحریر کیا ہے کہ ان کی شادی چالیس سال کی عمر میں والدہ ماجدہ بی بی رانی کے حکم کے مطابق حضرت سید احمد پسر مولانا جمال الدین مغربی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ان کے بطن سے انہیں دوصاحبزادے تولد ہوئے۔بڑے صاحبزادے کا نام حضرت سید محمد اکبرحسینی عرف میاں بڑے اور چھوٹے صاحبزادے کا نام سید محمد اصغرحسینی تھا۔

معراج العاشقین کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے خلیق انجم نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دکنی زبان اپنی لسانی خصوصیات کی وجہ سے شمالی ہند کی اردو سے کس طرح مختلف ہے۔موضوع کے اس عنوان میں انہوں نے اسماء وافعال، واحد جمع کے قاعدے، دکنی اور ہریانوی میں مشابہت، ضمائر علامت، فاعلی میں دکنی کا عام استعمال، حرف تخصیص کی، ہی، بھی کی جگہ ''چ'' کا استعمال، عربی اور فارسی الفاظ کا تلفظ کے اعتبار سے املا وغیرہ جیسی لسانی خصوصیات کا بہترین اورعمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔

اردو کا اولین نثرنگاراور پہلی نثری تصنیف کون سی ہے اس کے متعلق ہنوز محققین اور ناقدین میں بحثیں چلی آرہی ہیں۔روز کی نئی تحقیق سے نئے نئے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔''معراج العاشقین'' کی منشائے تصنیف اور موضوع و مطالب کے متعلق تمام محققین یک رائے ہیں۔لیکن یہ امر ہنوز متنازع رہ گیا ہے کہ کیا معراج العاشقین واقعی اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے یا نہیں؟اور کیا خواجہ بندہ نواز گیسودرازؔ اس کے حقیقی مصنف ہیں یا نہیں؟ مولوی عبدالحق،حکیم شمس الدین قادری، گوپی چند نارنگ اور خلیق انجم نے اسے اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا ہے۔اس بارے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:۔

''رسالہ معراج العاشقین کواردو کی ابتدائی نثری تصانیف میں جو اہمیت حاصل ہے' محتاجِ بیان نہیں۔''

(گوپی چند نارنگ،معراج العاشقین،ص۳)

خلیق انجم اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معراج العاشقین کے ابھی تک جتنے بھی نسخے ہیں اُن میں کسی پر بھی زمانۂ تصنیف نہیں ملا۔کسی خاص سنہ کا تعین کرنا تو ممکن نہیں لیکن اس چوتھائی صدی کا تعین ضرور کیا جاسکتا ہے جس میں وہ تصنیف کی گئی ہے۔معراج العاشقین میں دکنی الفاظ اورمحاورے اس کے شواہد ہیں کہ یہ دکن میں

ہی لکھی گئی اور اہل دکن کے لیے لکھی گئی۔ دوسری بار آپ 804ھ میں دکن تشریف لے گئے تھے اور 825 ہجری میں وہاں انتقال فرمایا۔اسی بیس اکیس سال کے عرصے میں یہ کتاب لکھی گئی۔'' (خلیق انجم، معراج العاشقین مع دکنی کلام، ص ۵۱)

مذکورہ بالا عبارات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ خلیق انجم اور گوپی چند نارنگ معراج العاشقین کو اردو کی اولین نثری تصنیف اور خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کو اس کا مصنف قرار دیتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ اپنی تصنیف ''معراج العاشقین کا مصنف'' میں دعوی کرتے ہیں کہ نہ تو اس کے مصنف خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ ہیں اور نہ ہی یہ اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ان کے دلائل کے مطابق یہ کتاب گیارھویں صدی عیسوی کے آخر اور بارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک صوفی بزرگ شاہ مخدوم حسینی بلکانوری نے تخلیق کی ہے۔ان کے مطابق بیجاپوری تصوف کے قلمی سرمائے (9) میں مخدوم شاہ حسینی بلکاری کے تین رسالے شامل ہیں جن میں ایک رسالے کے نسخے کم اور دو کے زیادہ نسخے موجود ہیں۔اس رسالے کا نام ''تلاوۃ الوجود'' ہے۔ انہوں نے ان تینوں رسالوں میں تفریق واضح کرتے ہوئے نسخوں کے مطابق ان کا نام الف، ب اور ج رکھا ہے۔مرزا قتیلؔ کے مطابق معراج العاشقین کا تعلق نسخہ ''الف'' اور نسخہ ''ب'' کے ساتھ زیادہ ہے۔نسخہ ''الف'' کے نسخے کم ملتے ہیں جبکہ نسخہ ''ب'' اور نسخہ ''ج'' کافی مقدار میں موجود ہیں۔اپنے دلائل کو بیان کرتے ہوئے مرزا حفیظ قتیلؔ لکھتے ہیں:

''رسالہ (ب) کا آغاز رسالہ (الف) کے تیسویں باب سے ہوتا ہے اور اپنے نو ابواب میں رسالہ (الف) کے آخری بارہ ابواب کو سمیٹ لیتا ہے۔اس کے پانچ ابواب رسالہ (الف) کے ابتدائی ابواب میں سے لیے گئے ہیں۔ اگر چہ معراج العاشقین میں ابواب کی سرخیاں نہیں ہیں لیکن مباحث کی ترتیب وہی ہے جو رسالہ (ب) کی ہے۔''

(ڈاکٹر حفیظ قتیل، معراج العاشقین کا مصنف، ص۲۳،۲۴)

مذکورہ تینوں رسالوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ لکھتے ہیں:

1۔مطبوعہ معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے۔

2۔معراج العاشقین بنیادی رسالہ ہے اور تلاوۃ الوجود اس کی شرح ہے۔

لیکن جب ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ متن کا موازنہ کرتے ہیں تو وہ اپنے آخرالذکر خیال کو رد کرتے ہیں اور پھر نئے اور پیچیدہ دلائل کے ذریعے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہیں صرف چار ایسے رسالے دستیاب ہوسکے ہیں جن کا نام معراج العاشقین ہے۔ ان میں سے پہلے دو رسالے (ب) تلاوۃ الوجود کے نسخے ہیں۔تیسرا رسالہ معراج العاشقین ہی ہے۔اس رسالے

کا ابتدائی حصہ مختلف ہے اور چوتھا رسالہ من وعن مطبوعہ معراج العاشقین کا نسخہ ہے۔ان رسالوں کے ضمن میں ایک اور رسالہ کا ذکر ضروری ہے جس کا نام معراج العاشقین تو نہیں ہے۔البتہ مطبوعہ معراج العاشقین کی طرح یہ رسالہ بھی رسالہ (ب) تلاوۃ الوجود کا ایک علحدہ خلاصہ ہے۔

حفیظ قتیلؔ ان رسالوں کے موضوعات کی تفصیل بیان کرنے اور ان رسالوں میں تفریق واضح کرنے کے بعد معراج العاشقین کے موضوع پر بحث کرتے ہیں۔اس کے بعد وہ معراج العاشقین کا تعلق حضرت امین الدین اعلیٰ کے سلسلہ تصوف سے جوڑتے ہیں اور اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس تصنیف کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری کا ہے۔اپنا یہ نظریہ وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''معراج العاشقین کے مضامین یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ رسالہ امینؔ کی تعلیمات سے مستفاد ہی نہیں بلکہ ان پر اضافہ بھی ہیں۔اس رسالے کا عہد تصنیف یقیناً حضرت امینؔ (وفات 1085ھ) کے بعد کا زمانہ ہے۔''

(ایضاً،ص ۵۶)

ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ نے مذکورہ اقتباس میں جو خیال پیش کیا ہے اس کی تائید ڈاکٹر سیدہ جعفرؔ نے ''دکنی نثر کا انتخاب'' میں ان الفاظ میں کی ہے:

''اس انتخاب میں اس لیے برہان الدین جانم کی تحریر سے کی گئی ہے کہ وہی دکن کے پہلے مصنف تھے اور تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ''معراج العاشقین'' خواجہ بندہ نوازؔ کی تصنیف نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی کی نثری کاوش ہے جو گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کے اوائل کے مصنف تھے۔خود مخدوم شاہ حسینی کی تلاوۃ الوجود کا انتخاب بھی اسی کتاب میں شامل ہے۔'' (ڈاکٹر سیدہ جعفر، دکنی نثر کا انتخاب (ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج تک)،ص ۶)

ڈاکٹر حفیظ قتیلؔ معراج العاشقین کی زبان پر بھی شک کرتے ہیں۔اپنی اس شک کی بنیاد پر وہ مولوی عبدالحق کی مرتب کردہ معراج العاشقین کی زبان اور تلاوۃ الوجود کی زبان کا موازنہ کرتے ہیں۔موازنہ کرنے کے بعد وہ اپنے دلائل میں لکھتے ہیں کہ کسی کتاب کے عہد تصنیف کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے کتاب کا لسانی مطالعہ بہت حد تک معاون ثابت ہوسکتا ہے۔لیکن ان کے مطابق معراج العاشقین کی عبارت اس قدر غلط اور الجھی ہوئی ہے کہ اس کے مطالعے سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔باوجود اس کے حفیظ قتیلؔ کے مطابق معراج العاشقین کے موجودہ متن میں جو صوتی اور صرفی شکلیں ملتی ہیں، وہ وہی ہیں جو گیارھویں صدی کے نصف آخر اور بارھویں صدی ہجری کی نثر میں موجود ہیں۔اس مناسبت سے رسالہ معراج العاشقین شرح تمہید ہمدانی اور شرح

مضامین

مرغوب القلوب، رسالہ وجودیہ اور ذکر نامہ، ترجمہ شمائل الاتقیا، خلاصۃ الرویا کی صف میں آتا ہے۔ حفیظ قتیل کے الفاظ میں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھنا چاہیے۔ معراج العاشقین پر اعتراض کرتے ہوئے اول تو وہ مولوی عبدالحق کا حوالہ دیتے ہیں اور دوسری بات وہ اپنی کتاب ''معراج العاشقین کا مصنف'' میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ معراج العاشقین دراصل تلاوۃ الوجود ہے۔ لیکن باوجود اس کے وہ مولوی عبدالحق کی ایک بات کو قبول کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''البتہ عشق نامہ مصنف عبداللہ بن محمد عبدالرحمٰن چشتی میں خواجہ صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں ''معراج العاشقین'' اور ''ہدایت نامہ'' کے ذکر سے مولوی صاحب کا یہ قیاس کسی حد تک درست ہوسکتا ہے کہ معراج العاشقین کے نام سے انہیں جو دکنی رسالہ ملا ہے وہ خواجہ صاحب کا وہی رسالہ ہے جس کا ذکر ''عشق نامہ'' میں ملا ہے۔'' (ڈاکٹر حفیظ قتیل، معراج العاشقین کا مصنف، ص ۷)

علاوہ ازیں انہوں نے اس بات کی تصدیق بھی کی ہے کہ ''عشق نامہ'' انہیں حاصل نہیں ہوسکی ہے۔ یہاں ان کے اختلاف کمزور پڑ جاتے ہیں۔ کیوں کہ جس کتاب تک خود ان کی رسائی ممکن نہ ہوسکی ہو وہ اس پر شک کیسے کر سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ دو مختلف داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ معراج العاشقین کے مصنف بندہ نواز گیسودرازؒ نہیں بلکہ گیارھویں صدی ہجری کے اواخر اور بارھویں صدی ہجری کے اوائل کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی ہیں۔ رہا سوال 906ھ کا تو اس بارے میں ڈاکٹر قتیل یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد قاسم کا نسخہ انہیں دستیاب نہیں ہوسکا ہے اور نہ ہی معراج العاشقین کا کوئی دوسرا نسخہ انہیں دستاب ہوسکا ہے جس سے اس سند کی تائید یا تردید ہوسکے۔ چوں کہ ان کے مطابق معراج العاشقین تلاوۃ الوجود نسخہ (ب) اور تلاوۃ الوجود نسخہ (الف) کا خلاصہ ہے اور رسالہ (الف) اور رسالہ (ب) دونوں کے مصنف مخدوم شاہ حسینی ہیں۔ ان دونوں نسخوں کا موضوع اجتہادی تصوف ہے۔ اس لیے گمان یہی ہے کہ ڈاکٹر محمد قاسم کا نسخہ جس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے اس کا سنہ 906ھ غلط ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی حفیظ قتیل کے ان دلائل کو بنیاد بنا کر لکھتے ہیں:۔

''معراج العاشقین جس اردو میں لکھی گئی ہے وہ ساخت کے اعتبار سے واضح اردو ہے' جبکہ اسی وقت یعنی نویں صدی ہجری میں اتنی صاف اردو نہیں تھی۔ معراج العاشقین کی زبان برج بھاشا اور کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی دہلی کی زبان ہے۔ جبکہ خواجہ صاحب کا تعلق گلبرگہ سے تھا۔'' (جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ص ۱۵۹)

مضامین

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اول تو انہوں نے تلاوۃ الوجود کے صحیح زمانے کا تعین نہیں کیا ہے۔دوسری بات ڈاکٹر قتیل نے معراج العاشقین اور تلاوۃ الوجود کے متن کا موازنہ نہیں کیا ہے۔تیسری بات یہ کہ وہ معراج العاشقین کے سنہ کتابت کے بارے میں بھی شک میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اپنے دعوے کی دلیل کے ثبوت میں لکھتی ہیں کہ اول تو بندہ نواز گیسودراز کے اسلاف دوسو سال دہلی میں مقیم تھے۔لہذا ان کا دلی کی مقامی زبان سے واقف ہونا لازمی تھا۔دوسری بات یہ کہ خواجہ صاحب کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔اس سے پہلے کی صدیوں میں اردو نثر کا ارتقا مستقل ہوتا رہا ہے۔ان کے زمانے تک اردو زبان ارتقا کے کئی مراحل طے کر چکی تھی۔اس طرح کی تحریر و تقریر کی گنجائش پیدا ہو چکی تھی۔تیسری اور اہم بات یہ کہ اکثر رسالے جو دستیاب ہو چکے ہیں وہ انہی کے سلسلے کے بزرگوں کے ملفوظات میں دستیاب ہوئے ہیں اور جس حالت اور جس طریقے پر وہ دستیاب ہوئے ہیں اسے دیکھتے ہوئے انہیں غلط طور پر خواجہ صاحب کے رسالوں سے منسوب کیے جانے یا کسی قسم کی تحریف کی ضرورت اور گنجائش محسوس نہیں ہوئی ہے۔

مذکورہ تمام بحث و مباحثے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق ،ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ،ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ معراج العاشقین کو اردو نثر کی ابتدائی تحریر اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو اس کا مصنف تسلیم کرتے ہیں۔لیکن عبدالحق مقدمہ میں اس بات کی تائید بھی کرتے ہیں کہ اگر معراج العاشقین کے مصنف خواجہ بندہ نواز نہیں ہیں تو پھر یہ اسی عہد سے وابستہ کسی دوسرے مصنف کی تصنیف ہے۔ڈاکٹر حفیظ قتیل اور جمیل جالبی کے قیاس اس کے مترادف ہیں۔وہ نہ تو معراج العاشقین کو پہلی اردو نثری تصنیف مانتے ہیں اور نہ ہی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو اس کا مصنف مانتے ہیں۔لہذا میرا یہ قیاس ہے کہ جمیل جالبی اور حفیظ قتیل نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ اتنے مضبوط اور مستحکم نہیں ہیں کہ ان کی بات کو حتمی تسلیم کیا جائے۔کیوں کہ اول تو نہ ہی تحقیق میں کوئی حتمی بات ہوتی ہے اور دوسری بات ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بھی مولوی عبدالحق کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں ''عشق نامہ'' موصول نہیں ہوئی ہے۔ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے مولوی عبدالحق کا قیاس درست ہو۔جہاں تک جمیل جالبی کا تعلق ہے تو انہوں نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کے خیال کو بنیاد بنا کر معراج العاشقین کے اسلوب اور انداز بیان پر مولوی عبدالحق سے اختلاف رائے کیا ہے۔

☆☆☆

مشتاق فاروق
ریسرچ اسکالر،یونی ورسٹی آف حیدرآباد،
گچی باؤلی،حیدرآباد 500046 تلنگانہ
موبائل نمبر:6005032120

''غالب کے خطوط یا منظر کشی''

''غالب''،یعنی غلبہ پانے والا چیزوں پر غالب آنے والا ، ہم یہاں مرزا اسد اللہ خان غالب کے غلبے کی بات کرنے کی جسارت کریں گے جنہیں شعری ادب وفنون بلکہ ادب کی ہر صنف پر غلبہ حاصل تھا، جس کو مختلف ادوار میں غالب شناسوں نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا جہاں غالب کو غزل ،نظم ،قصیدہ ،مرثیہ اور دوسری تمام اصنافِ ادب پرغلبہ حاصل تھا وہیں انہیں نثری ادب یعنی نثر نگاری پر بھی کمال حاصل تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔

غالبؔ کی نثر نگاری کی جب بات آتی ہے تو غالب کے خطوط کو بھی غالب کی نثر نگاری کا بیش قیمت اساسہ مانا جائیگا ۔غالب کے خطوط کے مطالعے سے قاری اس دور میں پہونچ جاتا ہے جہاں غالب خود موجود تھے ، اندازتحریر کا کیا پوچھئے کہ سارا منظر قاری کی چشم تصویر میں گھوم جائے، گویا غالب آپ کے سامنے بیٹھے اور مخاطب سے محوِ گفتگو ہوں۔

مندرجہ ذیل غالبؔ کے چند منتخب خطوط کو پیش کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر قاری ضرور ہمارے خیالات سے متفق ہوگا۔

غالبؔ نے یہ خط اپنے ہم نوا مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ہے جس میں اُن سے غمگساری کے ساتھ مزاج کی شوخی بھی محسوس کی جائے گی جس سے شائد غالبؔ کا مقصد اپنے دوست کا غم غلط کرنا ہو اور یہ انداز صرف غالبؔ کا ہی ہوسکتا ہے ۔ملاحظہ ہو:

''جناب مرزا صاحب !

'' آپ کا غم افزانامہ پہنچا میں نے پڑھا ' یوسف علی خان کو پڑھوادیا انہوں نے میرے سامنے مرحومہ اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت ،سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب شعراء میں فردوسی اور فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں ، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور رپیشوا ہیں ،شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوئے ،اور فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے ، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو، لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری ، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری ،بھئ مغلچے بھی عجیب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اُسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی ''مغلچہ'' ہوں' عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی ، کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے ۔چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے یہ آں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا اس فن سے بیگانہ محض ہوگیا،لیکن اب بھی

مضامین

کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں، اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا، جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گذرتی ہوگی، صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو۔ بیت:

سعدی اگر عاشقی کنی وجوانی
عشق محمدؐ بس است و آل محمدؐ

اللہ بس، ماسویٰ ہوس۔

جون ۱۸۶۰ء۔ غالبؔ

ایک اور خط جو کہ نواب امین الدین احمد خان کے نام ہے۔جس میں غالبؔ کی منشا تعزیت ہی ہے لیکن اس طرز بیان کا کیا کہئے۔ ملاحظ فرمائیں:

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں، تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہارِ غم۔تلقین صبر۔ دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلیف محض ہے، جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو، تلقین صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا، پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے، رہی دعائے مغفرت، میں کیا میری دعا کیا؟ مگر چوں کہ وہ میری مربیہّ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔

مع ہذا تمھارا یہاں آنا سنا تھا اس واسطے خط نہ لکھا۔اب جو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور اس سبب سے آنا نہ ہوا یہ چند سطریں میں لکھی گئیں، حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

تمھاری خوشی کا طالب

۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء غالبؔ

یہاں غالب کے دو مختصر خطوط پیشِ خدمت ہیں جو کہ حکیم غلام نجف خان کو لکھے ہیں۔عموماً غالبؔ کے خط تفصیلی اور طویل پائے گئے ہیں، جب کہ یہ خط کچھ مختصر ہیں جس کی وجہ شاید ان کی مایوسی رہی ہوگی جو ان خطوط سے ظاہر ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

(1)

میاں!

تمہارا خط پہنچا، آج میں نے اس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرے کو روانہ کیا۔تم جو کہتے ہو کہ تم نے مجھ کو کبھی خط نہیں لکھا اور اگر شیخ نجم الدین حیدر کا خط نہ آتا تو اب بھی نہ لکھتے۔انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل ہے لکھنے کے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھونگا۔

ظہیر الدین کو میری دُعا کہنا اور پیار کرنا، تم کو اور ظہیر الدین کو اور اسکی ماں کو اور اس کی بہن کو اور اس کی لڑکی کو تمھاری ماں دعا کہتی ہے اور دعائیں دیتی ہے۔

یہ رقعہ حیدر کے نام کا ہے، ان کو حوالے کر دینا

شنبہ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء اسد اللہ

(2)

سعادت و اقبال نشان حکیم غلام نجف خان طال بقاؤہ

تمھارا رقعہ پہنچا۔ جو دم ہے غنیمت ہے اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں قلم ہاتھ میں لئے پر، جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لینگے، ورنہ اِناَ لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلیہ راجعون۔

نواسی کا معلوم ہوا حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی۔

تمھاری استانی تم کو اور ظہیر الدین کو اور اس کی ماں کو اس کی بہن کو دعا کہتی ہیں اور میں ظہیر الدین کو پیار کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں۔

سہ شنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء

غالبؔ

بصد شکریہ ''غالبؔ کے خطوط'' (جلد دوم)

مرتبہ: خلیق انجم

☆☆☆

محمد شوکت فہیم احمد
(ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد)
مکان نمبر 9-4-135/S/6، سلیم انکلیو
سات گنبد روڈ، ٹولی چوکی، حیدرآباد 500008

اللہ مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے ایک مرتبہ خداوند قدوس کے دربار میں یہ عرض کیا" ..یا اللہ! تو مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ فرمائے گا..؟" اللہ تعالی نے فرمایا" ..اے ابراہیم! کیا اس پر تمہارا ایمان نہیں ہے..؟" آپ نے عرض کیا.." کیوں نہیں ..میں اس پر ایمان تو رکھتا ہوں لیکن میری تمنا یہ ہے کہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں تا کہ میرے دل کو قرار آ جائے"..اللہ تعالی نے فرمایا" ..تم چار پرندوں کو پالو اور ان کو خوب کھلا پلا کر اچھی طرح ہلا ملا لو ..پھر تم انہیں ذبح کر کے اور ان کا قیمہ بنا کر اپنے گردونواح کے چند پہاڑوں پر تھوڑا تھوڑا گوشت رکھ دو ..پھر ان پرندوں کو پکارو تو وہ پرندے زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آ جائیں گے اور تم مردوں کے زندہ ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے".. چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مرغ 'ایک کبوتر 'ایک گدھ 'ایک مور .....ان چار پرندوں کو پالا اور ایک مدت تک ان چاروں پرندوں کو کھلا پلا کر خوب ہلا ملا لیا ..پھر ان چاروں پرندوں کو ذبح کر کے ان کے سروں کو اپنے پاس رکھ لیا اور ان چاروں کا قیمہ بنا کر تھوڑا تھوڑا گوشت اطراف و جوانب کے پہاڑوں پر رکھ دیا اور دور سے کھڑے ہو کر ان پرندوں کا نام لے کر پکارا.. یاایھا الدیک ..اے مرغ .... یاایتھا الحمامۃ ..اے کبوتر ..... یاایھا النسر ..اے گدھ.... یاایھا الطاؤس ..اے مور..... آپ کی پکار پر ایک دم پہاڑوں سے گوشت کا قیمہ اڑنا شروع ہو گیا اور ہر پرند کا گوشت پوست' ہڈی' پر الگ ہو کر چار پرند تیار ہو گئے اور وہ چاروں پرند بلا سروں کے دوڑتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ گئے اور اپنے سروں سے جڑ کر دانہ چگنے لگے اور اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے ..حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے مردوں کے زندہ ہونے کا منظر دیکھ لیا اور ان کے دل کو اطمینان و قرار مل گیا.. اس واقعہ کا ذکر خداوند کریم نے قرآن مجید کی سورہ بقرہ میں ان لفظوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے..

"اور جب عرض کی ابراہیم نے اے رب میرے! مجھے دکھا دے تو کیونکر مردے جلائے گا ..فرمایا کیا تجھے یقین نہیں ..عرض کی یقیں کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آ جائے ..فرمایا تو اچھا چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ہلا لے ..پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے ..پھر انہیں بلا وہ تیرے پاس چلے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے ..اور جان رکھ کہ اللہ غالب حکمت والا ہے ..(البقرۃ:۲۶۸)

مضامین

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور اسکولی تعلیم

تعارف:

مرکزی حکومت (بھارت سرکار) نے پچھلے سال 30/جولائی 2020 کو قومی تعلیمی پالیسی (نیشنل ایجوکیشن پالیسی، 2020) جاری کردی تھی۔ آزاد بھارت میں یہ تیسری قومی تعلیمی پالیسی ہے۔اس سے قبل یہاں پہلی قومی تعلیمی پالیسی (1968) اور دوسری قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں بنائی گئی تھیں۔مزید 1992 میں پروگرام آف ایکشن اور 2005 میں قومی درسیات کا خاکہ (NCF) بھی اس ضمن میں اہم ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی (2020) ایک ایسے ہندوستانی مرکوز نظامِ تعلیم کا تصور پیش کرتی ہے جو سب کو بنیادی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک معیاری تعلیم فراہم کر کے ملک کو پائیداری کے ساتھ ساتھ مساویانہ اور علم دوست سماج کی تشکیل کر سکے۔ جاری کردہ قومی تعلیمی پالیسی (2020) کو چار حصوں میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ اسکولی تعلیم، دوسرا حصہ اعلیٰ تعلیم، تیسرا حصہ توجہ کے دیگر اہم شعبے اور چوتھا حصہ عمل درآمد کی حکمت عملی یعنی عملی اقدامات پر مشتمل ہیں۔

اسکولی تعلیم:

یہاں پر ہماری گفتگو کا موضوع قومی تعلیمی پالیسی (2020) کا پہلا حصہ اسکولی تعلیم ہے۔ یہ پالیسی ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام خصوصی طور پر اسکولی تعلیم میں ساختی تبدیلی (Structural Change) اور نظامی اصلاحات پر زور دیتی ہے۔اس پالیسی میں اسکولی تعلیم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1. پہلا حصہ ماقبل تحتانوی سطح یعنی پری پرائمری یا آنگن واڑی تین سال اور پہلی اور دوسری جماعت دو سال پر مبنی ہوگا۔ اس طرح جملہ پانچ سال پر مشتمل پہلا حصہ کو پالیسی میں بنیادی یا اساسی (Foundational) تعلیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔
2. دوسرا حصہ تیسری، چوتھی اور پانچویں جماعت تین سال پر مبنی ہوگا جسے پالیسی میں ابتدائی یا تیاری کلاسوں (Preparatory) کی تعلیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔
3. تیسرا حصہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت تین سال پر مشتمل ہوں گے جسے پالیسی میں وسطانیہ (Middle) تعلیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔
4. چوتھا حصہ نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں جماعت چار سال پر مشتمل ہوں گے۔ جسے پالیسی میں ثانوی (Secondary) تعلیم کے نام

سے موسوم کیا گیا ہے۔ یعنی یہ نئی ساخت 5+3+3+4 یعنی کل پندہ سال پر اسکولی تعلیم مشتمل ہوں گے۔ اس طرح موجودہ بارھویں جماعت یعنی انٹرمیڈیٹ یا اعلیٰ ثانوی سطح (ہائر سکنڈری یا سینئر سکنڈری) کا نظام ختم ہوجائے گا اور اسے ثانوی (سکنڈری) تعلیم کے زمرے میں الحاق کردیا جائے گا۔

ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم: آموزش کی بنیاد:

پالیسی میں ابتدائی بچپن کی معیاری نشوونما، دیکھ بھال اور تعلیم کی فراہمی جلد سے جلد کرنے کی باتیں کہی گئی ہیں تاکہ 2030 تک یہ یقین دہانی کی جاسکے کہ پہلی جماعت میں داخلہ لینے والے سبھی بچے اسکولی تعلیم کے لیے پوری طرح سے تیار ہوں۔ اس ضمن میں نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) کے ذریعے آٹھ سال کی عمر تک کے سبھی بچوں کے لیے دو حصوں میں ''ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم کے لیے قومی درسیاتی یا نصابی اور تدریسی خاکہ'' یعنی National Curricular and Pedagogical Framework for Early Childhood Care and Education (NCPFECCE) تیار کی جائے گی۔ جس میں 0 سے 3 سال کے بچوں کے لیے ایک جزوی خاکہ اور 3 سے 8 سال تک کے لیے ایک جزوی خاکہ شامل ہوگا۔

پالیسی اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم کے لیے سہولیات اور وسائل مرحلہ وار ملک بھر میں فراہم کی جائے۔ سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ اور غیر مراعات یافتہ اضلاع اور مقامات کو خصوصی توجہ اور ترجیح دی جائے۔

مزید آنگن واڑی، آنگن واڑی پرائمری اسکولوں، پری پرائمری اسکولوں وغیرہ میں ابتدائی بچپن کی تعلیم کے نصاب اور درس و تدریس میں خصوصی تربیت یافتہ کارکنوں اور اساتذہ کی تقرری کی جائے۔ ابتدائی بچپن کی تعلیم تک سبھی بچوں کی رسائی کے لیے اعلیٰ معیار کے انفراسٹرکچر، کھیل کے ساز و سامان، اور تربیت یافتہ آنگن واڑی کارکنان اور اساتذہ کے ذریعے آنگن واڑی مراکز کو مضبوط بنایا جائے۔ دوپہر کے کھانے (مڈڈے میل) کے پروگرام کو بھی پرائمری اسکولوں میں تیاری کلاسوں (Preparatory Class) تک بڑھایا جائے۔ صحت کی نگرانی اور جانچ کی سہولیات جو کہ پہلے سے آنگن واڑی نظام میں دستیاب ہیں، اسے پرائمری اسکولوں کی تیاری کلاسوں کے بچوں کو بھی دستیاب کرایا جائے۔

پالیسی اس ضمن میں مزید وضاحت پیش کرتی ہے کہ ابتدائی بچپن کی تعلیم کے اساتذہ کے شروعاتی کیڈر تیار کرنے کے لیے آنگن واڑی کارکنان اور اساتذہ کو NCERT کے تیار کردہ نصاب اور تدریسی خاکہ کے مطابق منظم طریقے سے تربیت دی جائے۔ بارھویں (10+2) اور اس سے زیادہ تعلیمی لیاقت رکھنے والے آنگن واڑی

کارکنان اور اساتذہ کو ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم (ECCE) میں چھ ماہ کا سرٹیفکیٹ پروگرام کرایا جائے اور اس سے کم تعلیمی لیاقت رکھنے والوں کو ابتدائی خواندگی، اعداد و شمار اور ECCE کے دیگر متعلقہ پہلوؤں پر مشتمل ایک سالہ ڈپلومہ پروگرام کرایا جائے۔ ECCE کو مرحلہ وار طریقے سے قبائلی اکثریتی علاقوں کی آشرم شالاؤں میں بھی شروع کیا جائے۔ ECCE کے نصاب اور طریقہ تدریس کی ذمہ داری وزارت تعلیم کی ہوگی تا کہ پری پرائمری اسکول سے پرائمری اسکول تک اس کی تسلسل کو یقینی بنایا جاسکے اور تعلیم کی بنیادی پہلوؤں پر مناسب توجہ دی جا سکے۔ ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم کے نصاب کی منصوبہ بندی اور عمل آوری وزارت تعلیم، وزارت برائے ترقی بچے اور خواتین، وزارت برائے صحت اور خاندانی بہبود اور وزارت برائے قبائلی امور کے ذریعے مشترکہ طور پر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اسکولی تعلیم میں ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم کے ہم آہنگ انضمام اور مستقل رہنمائی کے لیے ایک خصوصی مشترکہ ٹاسک فورس تشکیل دی جائے گی۔

اسکولی تعلیم میں بنیادی خواندگی اور عددشماری: آموزش کے لیے ایک فوری ضرورت اور لازمی شرط:

سبھی بچوں کے لیے بنیادی خواندگی اور عددشماری (بنیادی شماریات) کو حاصل کرنا فوری طور پر ایک قومی مشن بنے گا جسے کئی محاذوں پر کیے جانے والے فوری اقدامات اور واضح اہداف کے ساتھ مختصر مدت میں حاصل کیا جائے گا۔

جس میں ہر طالب علم کو جماعت تین تک ابتدائی خواندگی اور عددشماری کو حاصل کرنا شامل کیا گیا ہے۔

یہ پالیسی پرائمری اسکول کے بچوں میں پڑھنے، لکھنے اور علم ریاضی یا عددشماری کو بنیادی خواندگی قرار دیتا ہے جسے 2025 تک آفاقی طور پر حاصل کرنے کا ہدف طے کیا گیا ہے۔ اس کے لیے جماعت ایک سے تین میں ابتدائی زبان اور علم ریاضی پر خصوصی توجہ مرکوز کی جائے گی تا کہ جماعت تین تک کے ہر طالب علم 2025 تک بنیادی خواندگی اور علم ریاضی (بنیادی شماریات) کی صلاحیتوں کا حامل ہوجائے۔ اس مقصد کے لیے وزارت تعلیم ترجیحی بنیادوں پر ایک ''قومی مشن برائے بنیادی خواندگی اور عددشماری'' یعنی National Mission on Foundational Literacy and Numeracy (NMFLN) قائم کرے گا۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اسکولوں میں اساتذہ کے خالی عہدوں پر جلد سے جلد مقررہ وقت میں مرحلہ وار طریقے سے بھرتی کی جائے گی۔ خصوصی طور پر پسماندہ علاقوں اور ان علاقوں میں جہاں طلبہ اور اساتذہ کا شرح تناسب (RTR) زیادہ ہو یا جہاں ناخواندگی کی شرح زیادہ ہو، وہاں مقامی اساتذہ یا مقامی زبانوں سے واقفیت رکھنے والوں کو ملازمت دینے میں خصوصی توجہ دی جائے گی۔ یہ یقینی بنایا جائے گا کہ ہر ایک اسکول میں طلبہ اور اساتذہ کا شرح تناسب 30:1 سے کم ہو اور سماجی و معاشی طور پر پسماندہ بچوں کی اکثریت والے

علاقوں کے اسکولوں میں طلبہ اور اساتذہ کا شرح تناسب 25:1 سے کم ہو۔ تعلیمی طور پر کمزور بچوں کو بنیادی خواندگی اور اعداد شماری سکھانے کے مقصد سے اساتذہ کو تربیت دی جائے گی، ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کی جائے گی تاکہ مسلسل پیشہ وارانہ ترقی کے ساتھ بنیادی خواندگی اور رعدد شماری کے ہدف کو حاصل کیا جاسکے۔

اس ضمن میں درسیات اور نصاب میں بنیادی خواندگی اور عددشماری پر اضافی توجہ دی جائے گی۔ اسکولی نصاب میں پڑھنے، لکھنے، بولنے، گننے (عددشماری) اور منطقی سوچ کو فروغ دینے والے مواد مضمون شامل کیے جائیں گے۔ طلبہ کو ان امور میں مکمل آموزش حاصل کرنے کے غرض سے سال بھر باقاعدہ مضامین اور اس سے متعلق سرگرمیوں کے ذریعے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ بنیادی خواندگی اور عددشماری پر زیادہ توجہ دینے کے لیے تعلیم اساتذہ اور ابتدائی جماعتوں کے نصاب کی تشکیل نو کی جائے گی۔ موجودہ وقت میں ECCE کی سبھی تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کا ایک بڑا حصہ پہلی جماعت میں داخل ہونے کے کچھ ہی ہفتوں بعد اپنے ہم جماعت ساتھیوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ اس لیے NCERT اور SCERT کے ذریعے پہلی جماعت کے طلبہ کے لیے عبوری تین ماہ کا کھیل پر مبنی ''اسکول تیاری ماڈیول'' بنایا جائے گا، جس میں حروف تہجی، آوازیں، الفاظ، تلفظ، رنگ، شکلیں اور اعداد وغیرہ کے سیکھنے پر مشتمل سرگرمیاں اور ورک بکس ہوں گی۔ اس ماڈیول کو عمل درآمد کرنے میں ہم جماعت ساتھیوں اور طلبہ کے والدین سے بھی مدد لی جائے گی۔ اس کے علاوہ ''دیکشا'' یعنی ''DIKSHA'' (Digital Infrastrutre for Knowledge Sharing) پر بنیادی خواندگی اور عددشماری پر اعلیٰ معیار کے وسائل کا ایک نیشنل ریپازیٹری دستیاب ہوگا۔ سبھی ہندوستانی اور مقامی زبانوں میں دلچسپ اور حوصلہ افزا ادب اطفال اور سبھی سطح کے طلبہ کے لیے اسکول اور مقامی کتب خانوں میں بڑی تعداد میں کتابیں دستیاب کرائی جائیں گی۔ ڈیجیٹل لائبریری قائم کیے جائیں گے۔ ایک ''نیشنل بک پروشن پالیسی'' مرتب کی جائے گی اور سبھی مقامات، زبانوں، سطحوں او رانواع میں کتابوں کی دستیابی، رسائی کو یقینی بنایا جائے گا۔

مزید برآں بچوں کی تغذیہ اور صحت بشمول دماغی صحت کا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے لیے مڈڈے میل پروگرام کو توسیع دی جائے گی۔ اسکول کے بچوں کو مڈڈے میل کے علاوہ ناشتہ بھی فراہم کیے جائیں گے۔ جہاں پکے ہوئے گرم کھانے کا نظم کرنا مشکل ہوگا، وہاں سادہ لیکن تغذیہ سے بھرپور دیگر اشیاء مثلاً گڑ کے ساتھ مونگ پھلی، گڑ ملا ہوا چنا، یا مقامی طور پر دستیاب پھل مہیا کرایا جائے گا۔ سبھی اسکولی بچوں کو خاص طور پر صدفی صد ٹیکہ کاری کے لیے اسکولوں میں باقاعدہ طبی جانچ کرائی جائے گی اور اس کی نگرانی کے لیے ہیلتھ کارڈ جاری کیے جائیں گے۔

قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 اسکولی تعلیم کے

ضمن میں ترک اسکول کی شرح میں کمی لانے اور ہر سطح پر تعلیم کی آفاقی دستیابی کو یقینی بنانے پر زور دیتی ہے۔ جسے یقینی بنانے کے لیے حق تعلیم قانون میں توسیع کی جائے گی۔

اسکولی تعلیم کے متعلق قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے دیگر اہم نکات:

1. اسکولی تعلیم کے نصاب اور تعلیمی ساخت 4 + 3 + 3 + 5 کے نئے ڈیزائن میں درس و تدریس کی تنظیم نو کی جائے گی اور اسکولی تعلیم کو جامع ، مربوط و مکمل ، خوشگوار اور دلچسپ بنایا جائے گا۔
2. طلبہ کی مکمل نشوونما اور ترقی کے لیے ضروری آموزش او رتنقیدی سوچ کو بڑھانے کے لیے نصاب کے مواد کو کم کر کے اس کو بے حد بنیادی چیزوں پر مرکوز کیا جائے گا۔ تجربات پر مبنی علم کے حصول پر زیادہ توجہ دی جائے گی۔
3. کورس کے انتخاب میں طلبہ کو اختیار دے کر اس عمل کو لچکدار بنایا جائے گا۔ ثانوی اسکولوں میں پڑھنے کے لیے خاص طور پر طلبہ کو زیادہ لچکدار موضوعات کے انتخاب کے متبادل دیے جائیں گے۔ جس میں جسمانی تعلیم ،فنون اور دستکاری اور پیشہ وارانہ موضوعات بھی شامل ہوں گے۔
4. کثیر لسانی اور زبان کی قوت: جہاں تک ممکن ہو ذریعہ تعلیم کم از کم پانچویں جماعت تک اور ترجیحاً آٹھویں جماعت تک یا اس کے بعد تک گھر میں بولی جانے والی زبان یا مادری زبان یا علاقائی زبان یا خطے کی زبان رکھا جائے گا۔ یہ طریقہ کار سرکاری اور غیر سرکاری دونوں اسکولوں میں اپنایا جائے گا۔ مرکزی اور ریاستی حکومتیں دونوں ملک بھر میں بری تعداد میں زبان کے اساتذہ دستیاب کرائیں گے خاص طور پر ان زبانوں میں جو آئین ہند کے آٹھویں شیڈیول میں درج ہیں۔ آئینی جواز ،عوام، علاقوں اور یونین کی امنگوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے کثیر لسانی یعنی سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد جاری رہے گا۔ کسی بھی ریاست پر کوئی زبان تھوپی نہیں جائے گی۔ اسکولوں میں تین زبانوں کا انتخاب ریاستوں اور علاقوں کے اعتبار سے طلبہ کے اختیار میں ہوگا۔ زبانوں کی تعلیم و تدریس کے لیے عملی اور اختراعی طریقے استعمال کیے جائیں گے جن میں سرگرمیوں ،فلم کی نمائش، تھیئٹر ،کہانی سنانا، شاعری اور موسیقی شامل ہیں۔
5. ضروری مضامین ،مہارتوں اور صلاحیتوں کا نصابی انضمام ہوگا۔ یعنی بنیادی سطح سے لے کر اوپر تک نصاب اور درس و تدریس کی از سرنو ترتیب کر کے وضع کیا جائے گا۔ جس سے ہندوستان کی ثقافت، روایات، وراثت، رواج، زبان، فلسفہ، جغرافیہ،

قدیم اور عصری علم، سماجی اور سائنسی ضروریات، سیکھنے کے اپنے طریقے کی عکاسی ہو سکے۔

6. اسکولی تعلیم کے لیے قومی تعلیمی درسیات یا نصاب کا خاکہ (NCFSE) این سی ای آر ٹی تیار کرے گی۔ یہ خاکہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے اصولوں پر مبنی ہوگا اور یہ تمام متعلقہ افراد اور اداروں، ریاستی حکومتیں، وزارتیں، ماہرین تعلیم کے مشورے سے ترتیب دیا جائے گا۔ علاقائی مواد اور چاشنی سے مزین قومی نصاب و درسی کتابیں تیار کی جائیں گی۔

7. اسکولی تعلیم میں رائج تجزیاتی عمل میں بدلاؤ لاکر توجہ تکمیلی اور امتحانوں میں رٹنے کی روایت سے ہٹا کر تشکیلی طریقہ کار پر مرکوز ہوگی جو کہ طلبہ کی صلاحیت پر مبنی ہوتا ہے اور مزید سیکھنے کی طرف راغب کرتا ہے۔

8. خصوصی صلاحیتوں کے حامل طلبہ کی امداد کی جائے گی ۔ بی۔ ایڈ کی تعلیم میں بھی خصوصی صلاحیت والے طلبہ کی تعلیم کے لیے خصوصی صلاحیت سازی کے پروگرام شامل کیے جائیں گے۔

9. اسکولوں میں معقول اور محفوظ بنیادی ڈھانچہ، بیت الخلاء، پینے کا صاف پانی، صفائی ستھرائی، بجلی، کمپیوٹر کی سہولیات، کتب خانے، انٹرنیٹ، کھیل کود اور تفریح کے سامان مہیا کرائے جائیں گے۔

10. سماجی انصاف اور مساوات کے حصول کے لیے تعلیم ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس کا معقول اور بہتر انتظام کو یقینی بنایا جائے گا۔

سنٹرل اڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (CABE) کو مضبوط بنانا:

سنٹرل اڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن ایک اعلیٰ ترین مشاورتی ادارہ ہے جو تعلیم کے شعبے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو مشورے دینے کا ذمہ دار ہے۔ یہ ادارہ پہلی بار 1920 میں قائم کیا گیا تھا، لیکن بعد میں تحلیل ہوگیا۔ یہ ادارہ 1935ء میں ایک بار پھر وجود میں آیا۔ تعلیمی شعبوں میں حکومتوں کے لیے یہ سب سے زیادہ اعلیٰ اور پرانا مشاورتی بورڈ ہے۔ اس ادارے کا مقصد نصاب اور درسیات کی تیاری میں ملک کے تمام تعلیمی اداروں کو تجاویز پیش کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ریاست اور مرکز کے لیے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرنے کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرانا بھی اس ادارہ کا ایک اہم مقصد ہے۔ کسی بھی قسم کے تعلیمی سوال کے سلسلے میں ریاست اور مرکزی حکومت کو مشورہ دینا بھی اس کا مقصد ہے۔

اس کے علاوہ مختلف تعلیمی امور پر سفارشات پیش کرنے کے لیے کمیٹیاں مقرر کرنا بھی اس ادارہ کا ایک اہم مقصد ہے۔ مزید تعلیم سے متعلق امور میں مختلف سرکاری ایجنسیوں، غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں سے ماہر جائزے (Expert Reviews)، معلومات اور تجاویز طلب کرنا

بھی اس ادارے کا اہم مقصد ہے۔

اس ادارے کے افعال میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ وقتاً فوقتاً تعلیمی معیارات کی پیش رفت کا جائزہ لیتا ہے، ریاست اور مرکزی حکومت کے ذریعے نافذ کردہ تعلیمی پالیسیوں کی تنقیدی جانچ کرتا ہے اور ملک کی تعلیمی ترقی اور بہتری کے لیے متعدد غیر سرکاری اور سرکاری ایجنسیوں کے ہم آہنگی کے بارے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو مشورے فراہم کرتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی (2020) میں عملی اقدامات

اور عمل درآمد کی حکمت عملی میں سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کو مضبوط بنانے کے متعلق امور پر بات کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لانے کے لیے قومی، ریاستی ادارہ جاتی اور انفرادی سطح پر ایک طویل مدتی وژن، ماہرین کی مسلسل دستیابی اور متعلقہ لوگوں کے ذریعے ہمہ گیر کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ پالیسی CABE کو بااختیار بنانے اور اسے مزید مستحکم کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ جو کہ نہ صرف تعلیمی اور ثقافتی ترقی سے متعلق معاملوں پر صلاح و مشورہ اور تجزیہ کے لیے فورم ہے بلکہ اس کے مقاصد اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اس بورڈ کو وسیع اختیارات حاصل ہوں گے۔ لہٰذا CABE، وزارت تعلیم اور ریاستی سطح کے اعلیٰ اداروں کے تعاون سے ملک میں تعلیم کی ترقی، ترتیب، تجزیے اور نظر ثانی کا کام انجام دے گی جو کہ قومی تعلیمی پالیسی کے وژن کو حاصل کرنے میں معاون ہوں گے۔

خلاصہ:

کسی بھی پالیسی کی تاثیر اس کے عمل درآمد اور نفاذ پر منحصر ہوتی ہے۔ اس قومی تعلیمی پالیسی (2020) کے نفاذ کے لیے بھی کثیر اقدامات اور اعمال کی ضرورت ہوگی جو مختلف ادارے ہمہ گیر اور منظم طریقے سے انجام دیں گے۔ ان اداروں میں وزارت تعلیم، سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، مرکزی اور ریاستی حکومتیں، تعلیم کی وزارتیں، ریاستی تعلیمی محکمے، تعلیمی بورڈس، این ٹی اے، اسکولوں کے انضباطی ادارے، این سی ای آر ٹی، ایس سی ای آر ٹی وغیرہ شامل ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں مذکورہ اسکولی تعلیم سے متعلق سبھی امور پر عمل درآمد کے بعد ہی پالیسی کے تعلیمی خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ کرونا جیسے وباء اور لاک ڈاؤن کے بعد حالات میں بہتری کے ساتھ ہی پالیسی کے ان تمام امور پر توجہ کے ساتھ عمل آوری کے اقدامات میں تیزی آئے گی اور ہمارا ملک مزید ترقی کی جانب گامزن ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد افروز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
(CTE) کالج آف ٹیچر ایجوکیشن
الیاس اشرف نگر، چندن پٹی،
لہریا سرائے، دربھنگہ۔846002۔ بہار
موبائل: +918885472844

تعلیم و روزگار

سائنسدان چاند کی مٹی میں پودوں کو اگانے میں کامیاب

☆ اپالومشن 11، 12 اور 17 میں خلابازوں کے ذریعے

چاندکی مٹ [illegible]

☆ سا [illegible]

صرف چ [illegible]

☆ مت [illegible]

استعمال ک [illegible]

☆ مت [illegible]

جانب ایک [illegible]

Arab [illegible]

پر پودے اگائے [illegible]

چاند پر خوراک اور آکسیجن پیدا کرنے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ اپالومشن 11، 12 اور 17 میں خلابازوں کے ذریعے مٹی کو زمین پر واپس لایا گیا تھا۔ پودے اگانے کے تجربے کے لیے ان کے پاس صرف 12 گرام [illegible] کے چمچ چاند کی مٹی تھی۔ فلوریڈا یونیورسٹی (یو ایف) کے امریکی محققین نے دکھایا کہ پودے چاند کی مٹی میں [illegible] کے ساتھ نمو پا سکتے ہیں اور بڑھ سکتے ہیں۔

جرنل کمیونیکیشنز بائیولوجی میں شائع ہونے والی ان کی تحقیق میں یہ بھی چھان بین کی گئی کہ پودے چاند کی مٹی، جسے قمری ریگولتھ (خاک) بھی کہا جاتا ہے، جو کہ زمین پر پائی جانے والی مٹی سے بہت مختلف ہے، پر تحقیق کی گئی۔

محققین نے ایک سادہ تجربہ ڈیزائن کیا کہ:

[illegible] ل۔

[illegible] ٹھے کے

[illegible] ں کی نشونما

[illegible] ریباً ایک

[illegible] نے مٹی کو

[illegible] بوئے۔

اس طرح ایک چھوٹے قمری باغ کو تیار کیا گیا۔ Arabidopsis کے بیج اکثر تحقیق میں بڑے پیمانے پر استعمال ہوتے ہیں کیونکہ اس کے جینیاتی کوڈ کا مکمل نقشہ بنایا گیا ہے۔

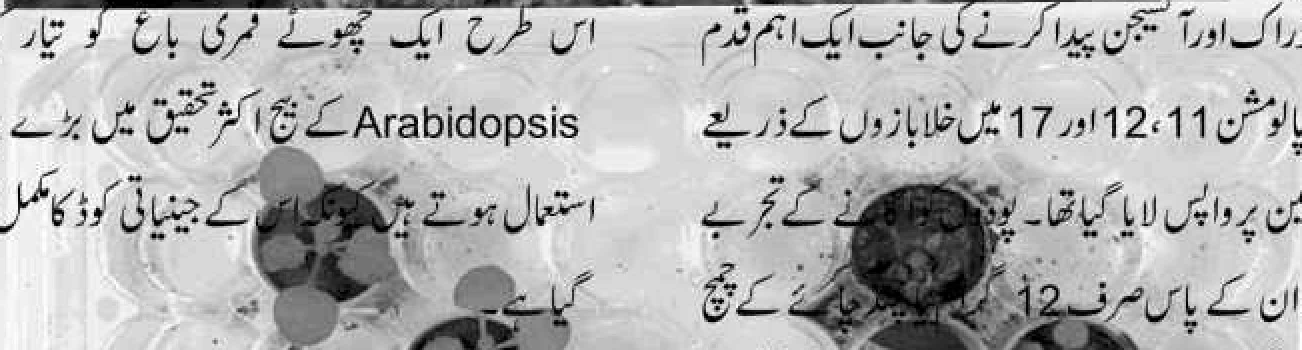

[illegible] وپسس، تھالیانا، یوریشیا اور افریقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ [illegible] رائی اور دیگر سبزیوں جیسے بروکولی، پھول گوبھی اور بروسلز کا رشتے دار ہے۔ یہ سائنسدانوں کے لئے بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اپنے چھوٹے سائز اور نشونما میں آسانی کی وجہ سے دنیا کے سب سے زیادہ زیر مطالعہ پودوں میں سے ایک ہے جو پودوں کی حیاتیات کے تمام شعبوں میں تحقیق کے لیے ایک

نمونہ حیات کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح سائنسدان پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ اس کے جین کیسے دکھائی دیتے ہیں اور مختلف حالات میں کس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ خلاء میں کس طرح بڑھتا ہے۔

سائنس دانوں نے عربیڈوپسس کو چاند کی مٹی (Regolith) میں اگانے کے لیے پہلے سے تیار شدہ نمونوں میں پانی اور بیج شامل کیا پھر انہوں نے ٹرے کو صاف کرنے میں ٹرریم خانوں میں ڈال دیا اور روزانہ ایک غذائیت کے محلول سے اس کو نم کیا۔ دو دن کے بعد محققین نے پایا کہ چاند کی مٹی میں لگائے گئے تقریباً تمام بیج نمو پا چکے تھے اور اگنے کے قابل تھے۔

ایک دوسرے [illegible] گروپ کی جانب سے [illegible] SC [illegible]

پال یونیورسٹی میں باغبانی کی سائنس ریسرچ پروفیسر آئینا لیزا نے کہا کہ:

"ہم حیران رہ گئے کہ تمام بیج نمو پا چکے تھے۔ ہم نے اس کی پیشین گوئی نہیں کی تھی۔ چاند کی مٹی پودوں کے نمو میں شامل ہارمونز اور سگنلز میں رکاوٹ نہیں ڈالتی ہے''۔

پال نے مزید کہا کہ چاند کی مٹی میں نمو پانے والے پودوں نے یہ ثابت کرنے میں مدد کی کہ چاند کی مٹی کے نمونوں میں پیتھوجینز یا دیگر نامعلوم اجزاء موجود نہیں تھے جو زمینی زندگی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ لیکن پودے صرف قمری ریگولیتھ (خاک) میں نمو پا گئے اور حقیقت میں پہلے کبھی چاند کی مٹی میں پودے نہیں اگائے گئے تھے۔

چاند کی مٹی کے نمونوں میں اگنے والے اور کنٹرول گروپ کے اگنے والے پودے ایک جیسے نظر آرہے تھے۔ چھٹے دن کے بعد تاہم یہ واضح تھا کہ پودے جو چاند کی مٹی میں نمو پائے تھے وہ اتنے مضبوط نہیں تھے۔ دونوں نمونوں میں پودے مختلف طریقے سے بڑھ رہے تھے۔ چاند کی مٹی کے نمونوں میں جڑیں اور کچھ کے پتے رکے ہوئے تھے اور سرخی مائل رنگت کے تھے۔ پودے چھوٹے تھے اور آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ آتش فشاں کی راکھ [illegible] والے پودے سائز [illegible] وسیع تھے۔

[illegible]

کے جینیاتی سطح پر معلوم ہوئی۔ ایسے پودے عام طور پر سخت ماحول میں زیادہ نمک یا دھاتوں سے پرمٹی سے نمٹنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بیس دن کے بعد پودوں پر پھول آنے سے ٹھیک پہلے ٹیم نے پودوں کی کٹائی کی اور RNA کا مطالعہ کیا۔ حیاتیاتی نظام میں جینس کو متعدد مراحل میں ڈی کوڈ کیا جاتا

ہے۔ سب سے پہلے جینز یا ڈی این اے، RNA میں نقل کیے جاتے ہیں پھر RNA کو پروٹین کی ترتیب میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ پروٹین ایک جاندار میں بہت سے حیاتیاتی عمل کو انجام دینے کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ RNA کو ترتیب دینے سے جین کے نمونوں کا انکشاف ہوا جن کا اظہار کیا گیا تھا۔

اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پودے چاند کی مٹی کے ماحول کو تناؤ میں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر ہم جین کے اظہار کے اعداد وشمار کو [illegible] بات کی نشاندہی کرنے میں مدد کے لئے استعمال [illegible] ہیں گے کہ ہم کس طرح تناؤ کے ردعمل کو [illegible] بنا سکتے ہیں جہاں پودے خاص کر فصلیں [illegible] بہت کم [illegible] ساتھ چاند کی مٹی میں اگنے کے قابل [illegible]

سائنسدانوں کے مطابق چاند [illegible] وافر مقدار میں پانی موجود ہے۔ اس لیے مزید تحقیق کے لیے جنوبی قطب پر روبوٹک گاڑیوں کو بھیجا جا رہا ہے۔ مستقبل میں روبوٹ کے ذریعے چاند پر پودوں کو اگانے کا تجربہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس سے خلائی تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ یہ تحقیق نہ صرف چاند پر رہائش گاہوں میں پودے اگانے میں معاون ہوگی بلکہ یہ خلابازوں کے چاند پر قیام میں بھی مدد کرے گی اور چاند پر اگلے انسانوں کی طرف سے اس تحقیق کو وسعت دینے کا راستہ فراہم ہوگا۔

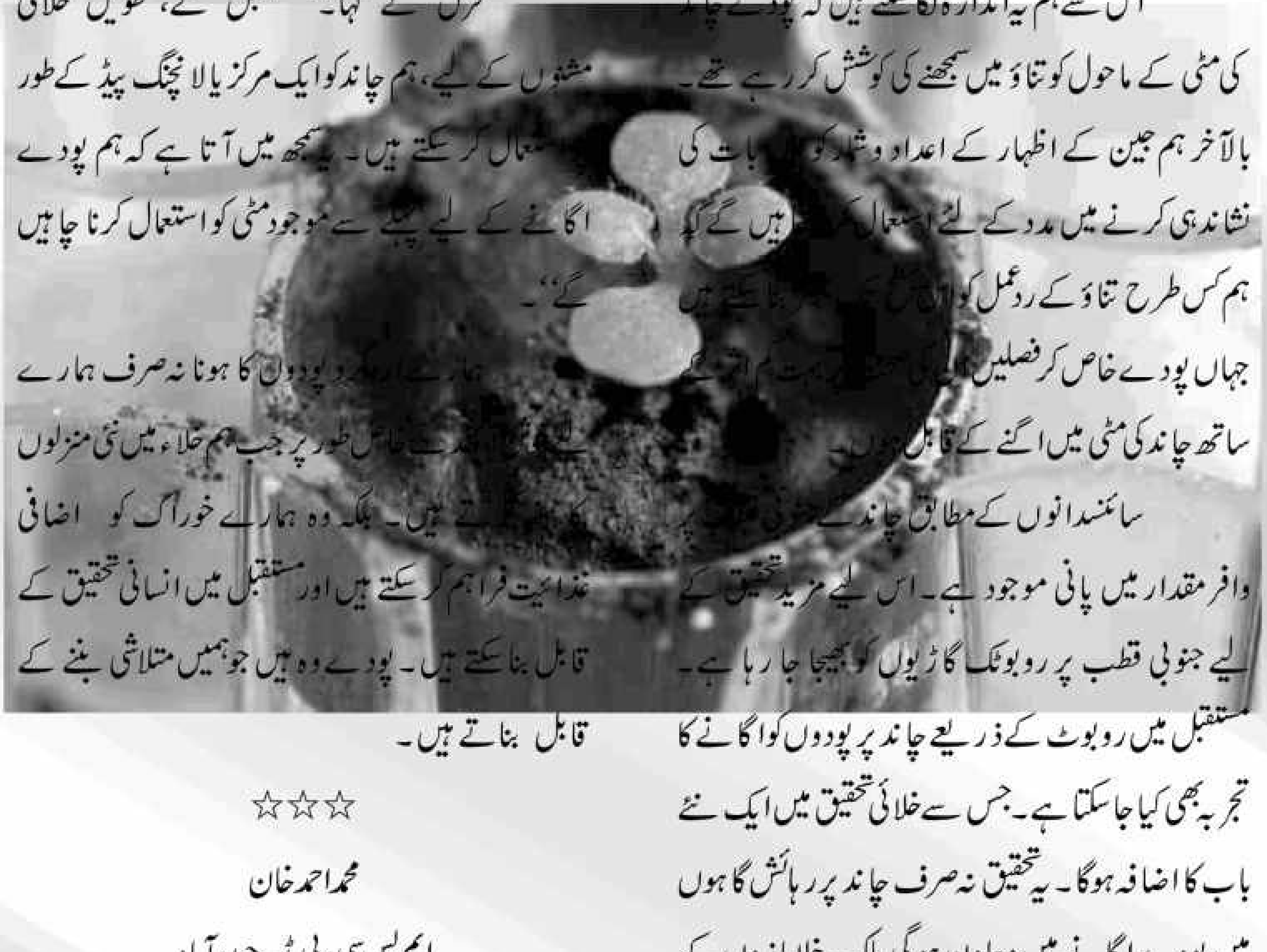

یہ تحقیق اس وقت سامنے آئی ہے جب ناسا کا آرٹیمس پروگرام انسانوں کو چاند پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مطالعہ کے مصنفین میں سے ایک اور UF انسٹی ٹیوٹ آف فوڈ اینڈ ایگریکلچرل سائنسز (IFAS/UF) کے پروفیسر روب فرل نے کہا، ''آرٹیمس کو خلا میں پودے اگانے کے بارے میں بہتر تفہیم کی ضرورت ہوگی۔''

فرل نے کہا۔ ''مستقبل کے، طویل خلائی مشنوں کے لیے، ہم چاند کو ایک مرکز یا لانچنگ پیڈ کے طور استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہم پودے اگانے کے لیے پہلے سے موجود مٹی کو استعمال کرنا چاہیں گے''۔

ہمارے [illegible] پودوں کا ہونا نہ صرف ہمارے لیے [illegible] خاص طور پر جب ہم خلاء میں نئی منزلوں [illegible] ہیں۔ بلکہ وہ ہمارے خوراک کو اضافی غذائیت فراہم کر سکتے ہیں اور مستقبل میں انسانی تحقیق کے قابل بنا سکتے ہیں۔ پودے وہ ہیں جو ہمیں متلاشی بننے کے قابل بناتے ہیں۔

☆☆☆

محمد احمد خان

ایم ایس سی، بی ایڈ۔ حیدرآباد

ph: 9848999241

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصّہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہوں گے۔ لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزا آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کیے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب ان ہی کو دیکھو...... صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو اسی دکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہے۔ ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے۔ نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انہیں ایسی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں ٹٹ پونجیوں سے ان کو ہمدردی ہے اور وہ انہیں اُلٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب گھنا ہوا، چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل، اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چیکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت برداشت نہیں ہوتی ہیں۔ کہتی ہوں آخر ٹٹ پونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تم ہی نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انہیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انہیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہیں کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ

کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کرسکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا، تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کیے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا، اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنہیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔

ان کی دوستی بھی انہیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلانچ، بے سروسامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے دیے اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمہارے دوست؟ تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔

ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کو اڈہ ہے۔ ذرا سا گھر، مشکل سے دو تو چار پائیاں، اوڑھنا بچھونا بھی بافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لیے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے۔ اس لیے انہیں چارپائی بھی چاہیے۔ اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے، جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں، گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں! بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آ جاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا، آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی

کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دکان داروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا، لیکن انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے، اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز اُدھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو۔ اور گرد کا یہ عالم کو سانس لینی مشکل مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا، ''اگر کل سے تو نے سلیقے سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔''

سویرے سو کر اٹھتی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے۔ گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنس کر کہا، ''دیکھتی کیا ہو، آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا، تم طریقہ تو بتلاتی نہیں ہو، الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔'' لیجئے صاحب! یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر، میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا، اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی، اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود مابدولت بڑی تن دہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے، اس کی تنخواہ تو بے باق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے، دوسرے آنکھیں دکھائے۔ اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی نہیں۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا، اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ یہ سادہ لوحی نہیں، سیدھی سادھی حماقت ہے۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشے

میں بدمست جھومتے دیکھا ہے۔ اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے۔ تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں؟ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں، گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور، کپڑے، شوق سنگھار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں، قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انہیں بخیل کہوں گی، مردہ دل ہی کہوں گی۔ فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر المزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی کی بات تو الگ ہے اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اُٹھائیں تو کون اُٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے، اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے، پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، جس پر اعتبار ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہاں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آجکل تحصیل دار ہیں۔ گھر کی جائیداد انہی کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں، موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں، مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی، میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے؟ کہنے لگے انہیں کیوں پریشان کروں۔ آخر انہیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا، تو آپ نے خط لکھا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا، لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا، ''کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟'' آپ نے ترش ہو کر کہا، ''ابھی ایک ہفتہ تو خط بھیجے ہوا۔ ابھی کیا جواب آسکتا ہے؟ ایک ہفتہ اور گزرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے۔ میری

خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادرم مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے، ملکی، مالی، اخلاق تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے، اتنی تفصیل اور شرح کیساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کیا چوکنے والی تھی، جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایایا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائیداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا، اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجی کوڑی بھی ہمیں نہ ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے۔ دو ہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو۔ تحصیل دار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے، رشوتیں بھی لیتے ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادرانِ یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں، سب کے سب اتنے شریر ہو گئے کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے۔ میں گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ''ابھی تک نہیں آیا۔ بڑا شیطان ہے۔ آج بچو آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں، مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کو تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں، ادھر لڑکا آ جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں کدھر سے آ گیا۔ وہ بچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدر و عافیت معلوم ہوگی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔

آپ نے ایک نئی اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انہیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا اُڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھے گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت

افسانے

دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کی کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے، گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمہیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے، نہ ہو، لیکن میرے بچوں کو خراب مت کیجئے، برے برے شوق نہ پیدا کیجئے۔ اگر آپ انہیں سدھا نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑیے تو مت۔ لگے باتیں بنانے، ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے۔ اور ان بھلے آدمیوں کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں، ان میں مزے سے بیٹھنا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ جیت کر آ جاتا تو کتنے خوش ہوتے ہیں، گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کھوٹی کوڑی بھی نہ دیں گے۔ چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں لیکن اس کا اثر عام حالات پر کم ہوتا ہے۔ اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس برس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا۔ اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیے، جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی۔ جب اس طرح ایک سال پورا گزر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انہیں پورا یقین تھا کہ ایک اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا، لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بے ہودہ ہے، یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپے کی کیا

افسانے

افسانے

ضرورت؟۔ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں وہ کیوں؟ یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگا دی۔ میری آبرو مٹا دی۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی۔ لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے جانور بھی دان دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے۔ کتنا سمجھتی ہوں۔ صاحب پرانا رواج ہے، شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہوگئے مگر آپ کان ہی نہیں دھرتے۔ پیروں پڑی، یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلوں گی۔ تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آ گیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر جھانکنے تک نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انہیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہوجاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہوگئے ہوں۔ اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے۔ وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں، اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہوسکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہوجانے کے اندیشے، ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف، بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

☆☆☆

بکھر گئے خواب بچپن کے......!

نبیلہ عام قسم کی لڑکیوں میں سے ہرگز نہ تھی، اسے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا...... اس نے ابتداء سے لے کر میٹرک تک کو- ایجوکیشن میں پڑھا تھا، کانونٹ اسکول اور سینٹ جوزف کالج میں اس کا واسطہ اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیوں سے پڑا تھا، اس کی وہ سہیلیاں جو امیر و کبیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اس کے بے پناہ حسن کی مدّاح تھیں، اس کا اُن کے گھروں میں آنا جانا، تقریبوں میں شرکت کرنا اور ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا، اسی لئے اس کی بھی اسی انداز سے تربیت ہوگئی تھی، عام طور پر وہ ایسا لباس پہنتی اور اپنے بال ایسے اسٹائل سے بناتی تھی کہ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ جاتے، بے حد حسن کے ساتھ ساتھ وہ بے انتہاء معصوم اور سادہ طبیعت کی مالک تھی، اسی وجہ سے وہ دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔

''امی! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں...... میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہو...... میں ایک سیدھی سادی گھریلو قسم کی لڑکی پسند کرتا ہوں۔'' حمزہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

''حمزہ! میں نے تمہاری پسند سے ہی نبیلہ کے بارے میں سوچا تھا کہ وہی میری بہو بنے گی، نبیلہ تمہارے ماموں کی بیٹی ہے...... اسے اچھی طرح جانتے ہو...... کل تک تو وہ تمہاری پسند تھی...... آج ایسا کیا ہوگیا کہ تم اپنی زبان...... اپنی پسند سے منحرف ہو رہے ہو؟'' امی طیش میں آگئی تھیں۔

''اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے، جہاں پڑھنے والی لڑکیوں کا کردار مشکوک ہوتا ہے۔''

''تم نے بھی تو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے...... اس وقت تمہارے ایسے خیالات نہیں تھے؟ میں بھائی جان اور بھابی کو کیا کہوں گی؟'' وہ بیٹے سے سخت ناراض ہو رہی تھیں۔

''بس امی! اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں خوش رہوں تو پھر میری خواہش کا خیال رکھیں۔'' وہ بے حسی سے کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا......۔

''لو! بھلا اب میں کس منہ سے بھائی جان سے کہوں گی کہ حمزہ نبیلہ سے شادی کرنے سے انکار کر رہا ہے......؟''

''امی! آپ اتنی پریشان نہ ہوں، ہم نے کونسا منگنی کی تھی......'' سارہ ماں کو تسلی دینے لگی۔

''باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی تو کیا ہوا...... کیا زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے......؟ کئی وقت میں بھابی سے کہہ چکی ہوں کہ نبیلہ ہی میرے حمزہ کی دولہن بنے گی......'' وہ باقاعدہ آنسو بہانے لگیں۔

''اگر نبیلہ یونیورسٹی میں داخلہ نہ لیتی تو یہ سب نہ ہوتا...... اسے کیا ضرورت ہے اتنا پڑھنے کی......؟ کیا ہم اسے نوکری کرانا چاہتے ہیں...... نہیں ناں! تو پھر......؟'' وہ دُکھ اور

پریشانی سے کہنے لگیں۔

''امی بات نوکری کی نہیں ہے، نبیلہ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے،...... یہ تو بھائی جان کی تنگ نظری ہے کہ معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر شادی سے انکار کر رہے ہیں...... وہ تو نبیلہ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا......'' سارہ ماں کو تسلی دینے لگی۔

سارہ کو اپنے بھائی پر بہت غصہ آ رہا تھا، نبیلہ اس کی کزن ہی نہیں؛ بچپن کی دوست بھی تھی...... تعلیمی مراحل دونوں نے ایک ساتھ ہی طے کئے تھے...... ڈگری کے بعد اُسے حمزہ نے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دی، اس لئے اس نے فیشن ڈیزائننگ کے کورس میں داخلہ لے لیا۔

''نبیلہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، مگر سب سے ضروری اور خاص بات یہ ہے کہ......'' کہتے کہتے سارہ سوچ میں پڑ گئی کہ کس طرح سے وہ حمزہ کی بات کہے۔

''ہاں! سارہ بولو ناں! کون سی خاص بات کرنی ہے؟''

''وہ دراصل بھائی جان کو پسند نہیں ہے کہ تم یونیورسٹی میں پڑھو۔''

''کیوں؟ کیوں پسند نہیں ہے؟...... کیا وہ نہیں جانتے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں؟''

''نبیلہ! تم نہیں جانتیں' انہوں نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے...... جس کی وجہ سے ہم سب بہت پریشان ہیں......''

''کیا؟ کیا کہا حمزہ نے......؟''

''وہ کہتے ہیں: میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہو۔''

سارہ کی لرزتی ہوئی آواز اس کے دماغ میں دھماکے پیدا کر رہی تھی...... اس کے دل میں نشتر بن کر چبھ رہی تھی...... وہ غم و غصہ سے نڈھال ہو رہی تھی۔

''نبیلہ کیا ہو گیا تمہیں؟ کچھ تو کہو......'' سارہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں! مجھے کچھ نہیں ہوا...... تم پریشان مت ہو۔'' بہت ضبط کے ساتھ کہتے کہتے دو آنسو اس کے رخسار پر بہہ ہی گئے۔

''ارے یہ کیا......؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو...... نبیلہ! پلیز تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں...... تم بھی میری طرح کسی شارٹ ٹائم کورس میں داخلہ لے لو ناں...... کیوں ایم اے کرنے کا سوچ رہی ہو؟'' سارہ نے جھجکتے ہوئے اسے اپنے دل کی بات بتائی۔

''سارہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیوں میں یونیورسٹی جانا چھوڑ دوں......؟ کیا مجھے حمزہ کو اپنے کیریکٹر کا ثبوت دینے کے لئے کوئی سرٹیفیکٹ دینا ہوگا؟...... نہیں! میں ایسا نہیں کروں گی،...... میرا مقصد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے، آگہی کے نئے دریچوں کو کھولنا ہے،...... مگر حمزہ کے مشکوک ذہن نے میرا وجود لہولہو کر دیا ہے۔'' وہ بولتے بولتے تھک سی گئی، اس نے اپنی آنکھیں موند کر چپ چاپ خدا سے شکوہ کیا......

''یا الٰہی! تو ہی ذہنوں کی کثافتوں کو دور کرنے والا

افسانہ

ہے۔''

''نبیلہ! کیا ہوا تمہیں...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے......؟'' سارہ بری طرح گھبرا گئی۔

''کچھ نہیں سارہ! میں ٹھیک ہوں، اچھا میں ذرا پھوپھو سے مل لوں......۔'' اس نے بڑی بہادری سے اپنے دکھوں کو دل میں چھپالیا، اور خود پر قابو پا کر آگے بڑھ گئی۔

نبیلہ رات کی تنہائی میں اپنے دل پر لگے زخموں کی تکلیف سہہ رہی تھی، اس نے کبھی تصور تک نہ کیا تھا کہ حمزہ اس کے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتا ہے، بستر پر لیٹتے ہی اس کے ذہن کے پردے پر پرانی یادوں کا عکس جھلملانے لگا۔

چند مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد حمزہ کے لئے ایک لڑکی پسند کر لی گئی...... جو اس کے خیالات کے مطابق بالکل ہی گھریلو لڑکی، صوم وصلوٰۃ کی پابند، باپردہ، باحیا اور بے حد شریف لڑکی تھی، لڑکی کا گھرانہ بہت مذہبی، والد صاحب اپنی اولاد سے بہت سختی سے دینی احکامات کی پابندی کراتے ہیں...... پروین نے بی اے کا امتحان بھی پرائیویٹ دیا تھا...... کیونکہ والد صاحب نے کالج جانے اجازت نہیں دی تھی، اس کی یہ ساری خوبیاں سن کر حمزہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔

حمزہ کی شادی طے ہوگئی...... اس کی شادی کا خوبصورت کارڈ دیکھتے ہوئے نبیلہ نے بڑے دُکھ سے سوچا،......اپنے درد کو دل میں چھپائے وہ شادی میں شرکت کی تیاری کرنے لگی۔

''نبیلہ! بھائی جان کی شادی کا سوچ کر مجھے بڑا عجیب لگ رہا ہے، اپنی بھابی کے روپ میں میں نے ہمیشہ تمہیں ہی سوچا ہے۔'' سارہ نے بڑے دُکھ سے کہا۔

''نہیں سارہ! تم ایسا مت سوچو......اکلوتے بھائی کی شادی ہے، تمہیں خوش خوش ہر رسم میں انجوائے کرنا ہے...... یہ موقع بار بار نہیں آتا......۔'' نبیلہ نے سارہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا! یہ تو بتاؤ......تم بھی ہر رسم میں شریک ہوگی ناں......؟ یہ نہیں کہ صرف نکاح والے دن ہی شریک ہوگی؟'' سارہ نے اس سے وعدہ لیا۔

''ہاں کیوں نہیں! ہر رسم میں ضرور شریک رہوں گی......میرے کزن کی شادی ہو اور میں نہ شریک ہوں...... بھلا ایسا کیسے ہوگا؟ میں تو خوب گانے بھی گاؤں گی اور تمہارے گھر پر بھی رہوں گی۔''

اس کے ہونٹ مسکرائے؛ مگر آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال ہوئی جا رہی تھی، اس نے سارہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

شادی سے دو دن پہلے سب کزنز نے حمزہ کے گھر پر ڈیرا جمایا تھا......سبھی ہنسی مذاق میں ایک دوسرے کو ستا رہے تھے...... نبیلہ کسی کام سے ٹیرس پر آئی تو اس کے پیچھے حمزہ بھی آیا۔

''تمہیں بہت دکھ ہو رہا ہوگا...... ہے ناں نبیلہ؟'' حمزہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

ایک لمحہ کو اس کا دل ڈول گیا......لیکن دوسرے ہی

لمحہ اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے حمزہ کی طرف دیکھا اور کہا:

''بالکل بھی نہیں!...... بلکہ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے آپ کی ذہنیت کا اندازہ پہلے ہی ہو گیا...... ورنہ آپ کی گھٹیا ذہنیت کا پتہ بعد میں چلتا تو زیادہ بُرا ہوتا......'' اس کے چہرے پر اعتماد کی چمک تھی، آنکھوں میں اس وقت نمی نہیں تھی؛ بلکہ بے پناہ سکون اور اطمینان کی سی کیفیت تھی...... وہ حمزہ کو بے سکون کر کے وہاں سے چلی آئی۔

دو دن بعد دولہن رخصت ہو کر گھر آ گئی تھی، دولہن کے کمرے میں ساری نوجوان پارٹی حمزہ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی، اب تک کسی نے بھی دولہن کی صورت نہیں دیکھی تھی...... حمزہ کو بھی دولہن کا چہرہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، کیونکہ سارہ نے اس کی بہت تعریف کی تھی...... اب تو دولہن کے روپ میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا ہوگا۔

جب حمزہ حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو دولہن سر جھکائے گھونگھٹ اوڑھے بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھی تھی...... دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ کچھ اور سمٹ گئی...... کام دار ڈوپٹہ درست کرتے ہوئے اس نے پہلو بدلا تو گھونگھٹ چہرے سے ہٹ گیا...... جیسے ہی حمزہ کی نظر دولہن کے چہرے پر پڑی تو اک دم چونک گیا......

''پمّی تم!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''پمّی'' نام سن کر پروین نے اپنا سر اُٹھایا...... اور پھر حمزہ پر نظر پڑتے ہی اس کو ہر چیز گول گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''تم!......اُفوہ!!...... تم ہی وہ معصوم اور مقدس لڑکی ہو جس کے چہرے پر کبھی کسی مرد کی نگاہ نہیں پڑی...... یہی کہا تھا ناں تمہارے والد نے......؟ لیکن میں جانتا ہوں تمہاری حقیقت...... پروین! اپنا نام چھپا کر پمّی کے نام سے تم نے میرے دوست شوکت حیات کے ساتھ محبت کی تھی...... محبت مائی فُٹ...... تم سے وہ فلرٹ کرتا تھا، تمہارے ملاقاتوں کے قصے وہ اپنے دوستوں میں ہنس ہنس کر سناتا تھا، اپنے ماں باپ کو دھوکہ دے کر تم شوکت کے ساتھ سارے جہاں میں پھرتی رہی ہو......'' غصہ، دُکھ اور پچھتاوے کے احساس سے حمزہ کے دماغ کی رگیں پھٹنے کی حد تک تن رہی تھیں۔

''میں آوارہ اور بے حیا نہیں ہوں......! میں نے تو شوکت حیات سے محبت کی تھی؛ لیکن اس نے مجھے دھوکہ دیا...... میرے ساتھ فلرٹ کیا......''

''محبت جیسے پاکیزہ لفظ کو اپنی زبان پر مت لاؤ...... تم جیسی بے حیا لڑکیاں جانتی ہیں محبت کیا ہوتی ہے؟ تم نے اپنے ماں باپ کو دھوکہ دیا...... غیر لڑکے کے ساتھ جگہ جگہ گھومتی پھرتی رہی ہو...... مجھے ایسی لڑکیوں سے سخت نفرت ہے...... تم میری منکوحہ کہلانے کے قابل نہیں ہو...... میں تمہیں چھوئے بغیر طلاق دے دوں گا......'' اس کی زبان سے الفاظ نہیں شعلے نکل رہے تھے...... جس سے پروین کا تن ہی نہیں من بھی جل کر خاکستر ہو رہا تھا۔

''خدا کے لئے یہ ظلم مت کریں مجھ پر!...... ابا جی تو

جیتے جی مر جائیں۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''جو لڑکیاں اپنے والدین کو دھوکہ دے سکتی ہیں وہ اپنے شوہر کی کیا وفادار ہوں گی، میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میری بیوی تم جیسی بے حیا لڑکی ہوگی...... تمہیں اپنے کئے کی سزاء بھگتنی ہوگی...... صبح ہی تمہیں فیصلہ سنا دوں گا۔''

وہ غصہ سے راستے کی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا کمرے کے باہر نکل گیا...... اور دولہن بنی پروین اپنا دل تھام کر رہ گئی۔

نبیلہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی...... اس کے پہلو میں لیٹی سارہ کب کا سو چکی تھی۔

''میری سوچوں پر، میرے خوابوں پر، میرے تصورات پر ہمیشہ تم ہی رہے ہو...... اب کوئی اور تمہاری جگہ کیسے لے سکتا ہے؟'' نبیلہ نے کروٹ لی تو بہت سارے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے...... وہ اپنے ہی خیالات میں گم تھی کہ باہر سے ہلکی ملی جلی آوازیں آنے لگیں...... سب لوگ سوئے گھنٹوں گذر چکے تھے، اب یہ آوازیں کیسی؟ وہ اٹھ کر دروازے کے قریب آ گئی...... پھوپھی جان کہہ رہی تھیں:

''آہستہ بولو حمزہ! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہے...... کسی کی آنکھ کھل گئی تو نہ جانے کیسی کیسی باتیں بنیں گی......؟''

''آپ لوگوں کی باتوں سے ڈر رہی ہیں...... یہاں میری زندگی برباد ہوگئی ہے۔''

''کیا ہوگیا ہے؟ کیوں اس طرح چراغ پا ہو رہے ہو؟ صبح بات کریں گے...... ابھی تو تم اپنے کمرے میں جاؤ...... دولہن کو گھر میں آئے چند گھنٹے بھی نہیں ہوئے اور تم نے اُسے اکیلا چھوڑ دیا...... نہ جانے وہ کیا سوچے؟''

آپ کو اس کی پرواہ ہے' اپنے بیٹے کی نہیں...... آپ کو معلوم ہے اس کا کیا کیریکٹر ہے؟ صرف حسن دیکھ کر آپ نے اسے پسند کرلیا، اور میں آپ کی پسند پر مطمئن ہوگیا......'' آہستگی سے کہتے ہوئے بھی حمزہ غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔

''صبح آرام سے بات کریں گے ناں...... بیٹا! اس وقت کچھ بھی کہنا سننا مناسب نہیں ہے......'' امی لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

''امی! اگر آپ نے اس کی تائید کی تو میں کچھ کر بیٹھوں گا...... صبح ہونے تک میں برداشت نہیں کرسکتا...... آپ جانتی ہیں وہ میرے دوست کے ساتھ...... نہیں ایسی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتا' اپنی زبان سے کیسے ادا کروں......؟'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''دیکھنے میں تو حمزہ وہ ایک بھولی بھالی، معصوم...... شریف سی لگتی تھی، میں کیسے اس کا کردار جان سکتی تھی...... کسی معصوم کے دل سے نکلی بد دعا کا اثر لگتا ہے۔'' انہوں نے سرد آہ بھری۔

''میں اسے برداشت نہیں کرسکتا...... اس کی شکل دیکھنا بھی مجھے گوارا نہیں...... میں اسے طلاق دے دوں گا۔''

انتہائی دکھ، کرب اور غصہ سے حمزہ کا برا حال ہو رہا تھا۔

''نہیں نہیں حمزہ!!! ہمارے خاندان میں ایسا کبھی

نہیں ہوا...... ایسی بدفالی منہ سے نہ نکالو بیٹا!...... سوچو ذرا پورے خاندان میں کس قدر بدنامی ہوگی...... اُف میرے خدا......!

پریشانی سے نبیلہ نے دروازہ کھولا...... پھوپھو جان کو حمزہ نے اپنی بانہوں میں سنبھالا ہوا تھا......۔

''کیا ہوا پھوپھو جان......؟ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے......چلیں اپنے کمرے میں۔''

انہوں نے بند ہوتی آنکھوں سے نبیلہ کی طرف دیکھا...... وہ برابر میں انہیں ان کے کمرے میں لے گئی، آرام سے انہیں بیڈ پر لٹایا...... ان کے ٹھنڈے برف ہوتے ہاتھوں کو سہلایا...... دو گھونٹ پانی پینے کے بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئیں۔

''نبیلہ! کیا کروں جان......؟ میں حمزہ کا دُکھ نہیں برداشت کرسکتی...... وہ انتہائی قدم اٹھا رہا ہے...... وہ کیا کرنے جارہا ہے، میں تو کہہ بھی نہیں سکتی......'' کہتے کہتے وہ بے قابو ہونے لگیں۔

کچھ دیر وہ انہیں تسلی دیتی رہی...... پھر نیند کی گولی کھلائی...... انہیں نیند لگنے تک سر دباتی رہی، کچھ دیر بعد وہ کمرے سے باہر آئی۔

باہر نکلتے ہی حمزہ پر نظر پڑی...... پریشان اور الجھا الجھا سا سامنے ہی کھڑا تھا...... وہ نظریں جھکائے سارا کے کمرے میں جا ہی رہی تھی کہ حمزہ نے اُسے پکارلیا۔

''نبیلہ......!''

''جی......!'' نبیلہ نے اُسے دیکھا...... جس کے چہرے پر پشیمانی...... پچھتاوے اور دُکھ کے ملے جلے احساسات تھے۔

''دو منٹ رُک کر میری بات تو سنو......!'' حمزہ نے بہ مشکل کہا۔

''جی نہیں!...... مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی......'' اس نے رخ موڑ کر جاتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی اس نے سارہ کے کمرے میں قدم رکھا...... دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی حمزہ بھی اندر آ گیا...... اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے خود بھی برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا کر رہے ہو حمزہ؟...... یہاں تمہاری موجودگی کو غلط رنگ دیا جاسکتا ہے۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے...... یقیناً اسی کی سزا ملی ہے مجھے...... اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کیا کچھ کھودیا ہے میں نے...... تمہاری عظمت و پاکیزگی کا چاند تمہارے ماتھے پر چمکتا رہا...... اور میں اندھوں کی طرح دیکھ نہ سکا...... اپنے ہی خود ساختہ خیالات کی زد میں رہا......''

''یہ وقت ان سب باتوں کا نہیں ہے حمزہ! تمہیں اپنے کمرے میں ہونا چاہئے......'' وہ بہت نرمی اور محبت سے اُسے سمجھا رہی تھی۔

''لیکن میرا دل و دماغ اسے قبول نہیں کر پا رہا ہے...... بہت ظلم و زیادتی ہوئی ہے میرے ساتھ...... میں کسی

ایسی لڑکی کو اپنا ہم سفر کیسے قبول کرسکتا ہوں جو میرے ہی دوست کے ساتھ فلرٹ کرتی رہی ہے...... کئی واقعات تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں، نبیلہ تم ہی کہو! میں اس کی ذات کو کیسے قبول کروں......؟'' مارے شرمندگی کے اس کی نظریں نہیں اُٹھ رہی تھیں۔

''کیسے قبول کروں؟ تم قبول کر چکے ہو حمزہ!...... نکاح کوئی معمولی بندھن نہیں؛ جسے جب چاہا باندھ لیا اور جب چاہا توڑ دیا...... ایسا ہرگز نہیں کرنا حمزہ!...... نکاح اور رخصتی کے بعد جب کوئی لڑکی اپنے شریک حیات کا ہاتھ تھام کر باپ کی دہلیز کو پار کرتی ہے تو وہ اپنا ماضی اسی دہلیز پر دفن کر دیتی ہے...... ایک اجنبی شخص کے ساتھ پوری دیانت داری سے ساتھ نبھانے کا وعدہ وہ اپنے آپ سے کر چکی ہوتی ہے...... تب وہ پلٹ کر نہیں سوچتی کہ ماضی میں اس نے کیا کیا تھا...... بلکہ اس کے آگے اپنے شوہر سے وفاداری کے تقاضے پورے کرنے کا عزم ہوتا ہے...... تم بھی اس کے ماضی کو مت کھولو...... جو ہوا سو ہو چکا...... اس کو ایک موقع تو ملنا ہی چاہئے......'' نبیلہ اپنے دکھوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے حمزہ کے خیالات کو بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ مت بھولو حمزہ! کہ نکاح صرف دو لوگوں کا بندھن ہی نہیں بلکہ یہ دو خاندانوں کی عزت و وقار کا بھی تقاضہ ہے...... طلاق کا لفظ سن کر پھوپھی جان کی کیا حالت ہوئی ذرا غور کرو...... پروین طلاق لے کر جب گھر جائے گی تو اس کے ماں باپ کا کیا حشر ہوگا؟...... تمہارے اس اقدام سے کتنے لوگوں کی جان پر بن آئے گی......؟ اور اس لڑکی کا کیا ہوگا جو اب تمہاری، تمہارے گھر کی اور تمہارے خاندان کی عزت ہے؟'' وہ آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں، اس کی سوچ میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہی تھی...... مگر حمزہ اپنے موقف سے ایک اِنچ ہٹنے تیار نہیں ہو رہا تھا۔

''نو! نیوَر...... میں کبھی اس کے ماضی کو نہیں بھول سکتا...... جان بوجھ کر مکھی نہیں نگل سکتا...... شوکت جیسے لڑکے کے ساتھ...... نہ جانے وہ کیا کیا کرتی رہی ہوگی......؟'' حمزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام رکھا تھا۔

''جو ہوا اُسے بھول جانے میں ہی ہم سب کی بہتری ہے...... یہ سب مقدر کے کھیل سمجھ کر آپ پروین کو معاف کر دیں...... ان سارے حالات کا ذمہ دار تو آپ کا دوست بھی ہے...... جس نے پروین کی معصومیت کا فائدہ اٹھایا...... ظلم تو پروین کے ساتھ ہوا ہے...... آپ اُسے سہارا دیں گے تو وہ آپ ہی کی ہو کر رہ جائے گی۔'' حمزہ نے ممنون نظروں کے ساتھ اُسے دیکھا...... اس کی آنکھوں میں ہمدردی، پیار اور معصومیت کے جگنو جگمگا رہے تھے۔

ممنونیت، احسان مندی سے اُٹھتے ہوئے اس نے نبیلہ کی طرف عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

''اگر دنیا میں فرشتوں کا وجود ہے تو تمہارا شمار ضرور ان فرشتوں میں ہوتا...... میری بدنصیبی کہ میں نے اپنی انا اور زعم کے نشے میں تم جیسے ہیرے کو کھو دیا...... مجھے معاف کر دینا نبیلہ!...... میں تمہارا گنہگار ہوں......'' کہتے

ہوئے وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

نبیلہ جب سونے کے لئے اپنے بیڈ پر آئی تو سارہ کو آنکھیں کھولے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

''ہائے سارہ! تم کب اُٹھیں؟ کچھ دیر پہلے تو تم بے خبر سو رہی تھیں؟''

''شکر ہے کہ میری آنکھ کھل گئی...... ورنہ میں تمہار یہ روپ کہاں دیکھ سکتی تھی''۔ کہتے ہوئے وہ نبیلہ سے لپٹ گئی۔

''افوہ! کیا کہہ رہی ہو؟ بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے؟......اچھا صبح بات کریں گے ......ابھی بہت نیند آرہی ہے، شب بخیر!'' نبیلہ نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''کیا ظرف پایا ہے نبیلہ تم نے! امی بالکل ٹھیک کہتی تھیں ''نبیلہ جیسا ہیرا دن کو چراغ لے کر ڈھونڈیں...... تب بھی کہیں نہیں ملے گا......ان سب حالات میں بھی تم نے بھائی جان کے بارے میں......ہم سب کے بارے میں...... ہمارے خاندان کے بارے میں اتنا اچھا سوچا، اور بھائی جان کو بھٹکنے سے بچا لیا...... ان کے ذہن کی ساری کثافتوں کو دھو دیا۔'' رقت زدہ لہجے میں کہتے ہوئے سارہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نبیلہ کے نین بھی بھیگنے لگے......لیکن دوسرے ہی لمحہ پروین کے بس جانے کی خوشی میں اس نے اپنے اشکوں پر بندھ باندھ دیا۔ بعض اوقات خود خوشی حاصل کرنے کے بجائے دوسروں کو خوشی دے کر انسان زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

افسانے

سنہرے اقوال

☆ اپنے دل کو اس وقت تک توڑتے رہو جب تک یہ کھل نہ جائے۔
☆ آپ کے اندر ایک ایسی طاقت ہے جو آپ کو زندگی بخشتی ہے، اسے تلاش کرو۔
☆ اپنی چالاکی بیچ دو اور حیرانگی خرید لو۔

(مولانا رومی)

☆ نادان ڈھول کے مانند ہوتا ہے، بلند آواز ہوتا ہے، مگر اندر سا خالی ہوتا ہے۔
☆ تعلیم انسان کو بولنا تو سکھا دیتی ہے مگر یہ نہیں سکھاتی کہ کب، کہاں اور کتنا بولنا ہے۔

(شیخ سعدی)

☆ اپنے آپ کو عزت دو گے تو دوسرے آپ کا احترام کریں گے۔

(کنفیوشس)

☆ جو شخص خطرہ مول لینے کے جرأت نہیں رکھتا وہ زندگی میں کچھ نہیں کر پائے گا۔
☆ ایک آدمی جو 50 سال کی عمر میں دنیا کو ایسے ہی دیکھتا ہے جیسے وہ 20 سال کی عمر میں دیکھتا تھا، تو اس نے زندگی کے 30 سال ضائع کر دیے۔

(محمد علی کلے)

☆ جس لمحہ آپ اپنے آپ کو اہمیت دینا شروع کریں گے یہ دنیا بھی اپ کو اہمیت دینا شروع کر دے گی۔
☆ انسان دوسرے انسان کو جو سب سے بڑا تحفہ عطا کر سکتا ہے وہ وقت ہے، اس سے قیمتی تحفہ انسان ,انسان کو نہی دے سکتا۔
☆ محبت دلوں پر وہ کام کرتی ہی جو صابن جسم پر، اور آنسو روح پر کرتے ہیں۔

(اشفاق احمد)

☆ بوجھ اٹھانے والا کسی پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتا۔
☆ سب جیسوں میں سب جیسا نہیں بننا، خود کو منفرد بنائیں خیالات شخصیت اور عادات کے لحاظ سے۔

(قاسم علی شاہ)

☆ مجھے لگتا ہے کہ عام لوگوں کے لیے غیر معمولی انتخاب کا انتخاب ممکن ہے۔

(ایلان مسک)

غزلیں

پروفیسر مظفر شہ میری
سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول، آندھرا پردیش۔

ہم کس زمیں پہ آگئے، یہ کیا مقام ہے
سر پر کھڑی ہے دھوپ اگر چپکہ شام ہے

اک دوپہر کا قہر ہی ہم پر مدام ہے
مدت سے اس نگر میں سحر ہے نہ شام ہے

شہرت بری نہیں ہے پہ اتنا خیال رکھ
بے وجہ جو ملے گی وہ عزت حرام ہے

رفتار کائنات وہی ہے جو پہلے تھی
اک آدمی ہی آج ذرا بے لگام ہے

بجلی کی طرح ناچ، زمانے کو بھی نچا
میدان زندگی میں تکلف حرام ہے

کتنے ہیں نوچ پھینک میاں لالہ و گلاب
اک ایک برگ گل پہ مظفرؔ کا نام ہے

-ooo-

شاہد ندیمؔ

جہاں میں آج بھی زندہ ہیں کل کی تصویریں
کسی بھی شخص کے اچھے عمل کی تصویریں

میں جانتا تھا کہ یہ زندگی کا حاصل ہیں
بدل بدل کے جو آئیں اجل کی تصویریں

بری بھلی ہوں یہ رہتی ہیں ساتھ صدیوں تک
نظر میں تیرتی رہتی ہیں پل کی تصویریں

میں اپنے دل کے ورق پر بنا تا رہتا ہوں
قلم کی نوک سے اپنے عمل کی تصویریں

اُس آئینے کو ہی دھندلا سمجھ کے توڑ دیا
جس آئینے میں تھیں موجود کل کی تصویریں

میں امتحان میں ہوتا بھی کیسے پاس کبھی
چرالیں علم کے رہبر نے حل کی تصویریں

کبھی تھی میرے مقدر میں کر بلا کی زمیں
بناتا کسے بھلا میں محل کی تصویریں

ندیمؔ آج بھی دیتی ہیں دستکیں دل پر
کسی خیال کے میٹھے سے پھل کی تصویریں

-ooo-

10/23، چون پزان، آگرہ۔282010، U.P.

غزلیں

اشہؔر ہاشمی

بلند آہنگ اور پر شور ہو کے گزرے
شکست سے انحراف کا زور ہو کے گزرے

بس ایک لمس تپشِ سے بخشی لپک سروں کو
تمہارے نغمات سے بس ایک پور ہو کے گزرے

کریہ موسم، کرخت آوازیں، کالے منظر
خود اپنے دن رات سے بہت بور ہو کے گزرے

وہ جس کی جانب سے سنگ گل بست آ رہے تھے
ہم اس سے بچتے کہاں، اسی اور ہو کے گزرے

جو لہر اٹھی ھے آسماں چھونے اس سے کہ دو
ہمارے قریہ سے پست کمزور ہو کے گزرے

ہے کون ایسا جو اس کے جلووں کی تاب لائے
ہے کون جو اس گلی سے چپ چور ہو کے گزرے

بہت سے لمحات ضد تھے اک دوسرے کے اشہؔر
بوہم اُن کے ہی درمیان سے ڈور ہو کے گزرے

-ooo-

apartmentrose401 ExtensionKunjKishan،51A
110092Delhi ـNagarLuxmi

جہانگیر قیاسؔ

جھوٹ کا دبدبہ ہے ترے شہر میں
ڈر کے سچ چھپ گیا ہے ترے شہر میں

کوئی سنتا نہیں بات مظلوم کی
ہر صدا بے صدا ہے ترے شہر میں

مندمل کوئی مرہم سے ہوتا نہیں
زخم ایسا ملا ہے ترے شہر میں

لے کے سکہ وفا کا کہاں جاوں گا
ہر کوئی بے وفا ہے ترے شہر میں

خون کی داستاں لکھی جانے لگی
اس قدر خوں بہا ہے ترے شہر میں

امن زخمی نظر آرہا ہے قیاسؔ
ہر طرف شر مچا ہے ترے شہر میں

-ooo-

18-8-244/C/54، عیدی بازار، حیدرآباد۔ T.S.

جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ محکمہ اقلیتی بہبود کے عہدیداران کے ساتھ جائزہ اجلاس میں۔تصویر میں جناب اے۔کے۔خان آئی پی ایس (موظف) عزت مآب مشیر اقلیتی بہبود تلنگانہ، جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، محترمہ کانتی ویسلی مینیجنگ ڈائرکٹر تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن ودیگر عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں

جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ، محابس وفائر سرویسیز حکومت تلنگانہ نے ریاست کے اقلیتی امیدواروں کوگروپ 1 امتحانات کے لئے اردو میں نصاب کی تیاری کے سلسلہ میں اقلیتی بہبود کے عہدیداروں اور بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ جائزہ اجلاس طلب کیا۔اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب اے۔کے۔خان آئی پی ایس (موظف) عزت مآب مشیر اقلیتی بہبود تلنگانہ، جناب اسحاق امتیاز معزز چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن، جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ، جناب سید عمر جلیل آئی اے ایس سکریٹری بورڈ آف انٹرمیڈیٹ تلنگانہ، جناب شاہنواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر اقلیتی بہبود تلنگانہ، پروفیسر ایس اے شکور سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ودیگر عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں۔

Urdu Monthly
Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Vol. 07 No. 06 June, 2022
RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Date of Publication : 15th of every month
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month
Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب کے۔چندر شیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ 2 جون 2022ء کو یوم تاسیس تلنگانہ کے موقع پر باغ عامہ نامپلی حیدرآباد میں پرچم کشائی انجام دیتے ہوئے۔
تصویر میں جناب سومیش کمار آئی اے ایس چیف سکریٹری حکومت تلنگانہ، جناب ایم۔مہندر ریڈی ڈائرکٹر جنرل آف پولیس تلنگانہ و دیگر اعلیٰ عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 040-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com